علامہ اقبالؒ کی عقیدت صوفیائے عظام سے

سید نور محمد قادری

علامہ اقبالؒ اپنے جدِ صوفیائے کرام کے معتقد تھے اور روایات تصوف سے گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ علامہ اقبالؒ کے ایک جد امجد کا ذکر سید نذیر نیازی مرحوم نے ان کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے۔

''ہمارے والد کے دادا یا پڑدادا پیر تھے۔ اُن کا نام تھا شیخ اکبر انہیں پیری اس طرح ملی کہ ''سن کھترا'' (سیالکوٹ) میں سادات کا ایک خاندان تھا جسے لوگ سید نہیں مانتے تھے۔ اس خاندان کے سربراہ کو ایک روز جو غصہ آیا تو ایک سبز کپڑا اوڑھ کر آگ میں بیٹھ گئے۔ جس کے متعلق روایت تھی کہ حضرت امام حسینؓ کی یادگار ہے۔ اُس کی برکت سے آگ نے اُن پر کوئی اثر نہ کیا۔ مخالفوں نے یہ دیکھا تو انہیں یقین ہوگیا کہ فی الواقعہ سید ہیں۔ اُن کا انتقال ہوا تو شیخ اکبر نے اُن کے مریدوں کو سنبھالا اور خاندان کی خدمت کرنے لگے۔ ایک مرتبہ اُسی خاندان کا ایک فرد والد ماجد کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ آپ دھسوں کی تجارت کیوں نہیں کرتے۔ اُس زمانہ میں معمولی دھسوں کی قیمت دو روپیہ فی دھسہ سے زیادہ نہ تھی۔ والد ماجد نے کوئی دو چار سو دھسے تیار کیے تو قدرت خدا کی ایسی ہوئی کہ سب اچھے داموں فروخت ہو گئے تو کافی روپیہ جمع ہو گیا۔ بس یہ ابتدا تھی ہمارے دن پھرنے کی''[۱]۔

۱۔ اقبال کے حضور تالیف سید نذیر نیازی کراچی ۱۹۷۱ء ص، ۱۶۹ - ۱۷۰ -

حضرت علامہ کے والد صوفی نور محمدؒ اور وہ خود سلطان العارفین حضرت سلطان محمودؒ دربار آوان شریف (گجرات) سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت[1] تھے۔ صوفی نور محمد صاحب کرامت بزرگ تھے اور جو کوئی بھی اُن سے ملتا اُن کے صوفیانہ مزاج اور اولیاء دوستی سے بہت متاثر ہوتا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم فرماتے ہیں۔

"راقم الحروف کو اُن کے والد ماجد شیخ نور محمد صاحب سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جس زمانہ میں علامہ اقبالؒ انارکلی میں رہتے تھے۔ وہ در حقیقت اسم بامسمّٰی تھے۔ نور ہدیٰ اُن کے چہرے پر متجلی تھا ..... وہ خدا رسیدہ صوفی تھے! پاکیزہ اسلامی تصوف کا ذوق اقبال کو باپ سے ورثہ میں ملا ..... پہلی ہی ملاقات میں شیخ نور محمد صاحب نے اقبال کی پیدائش کا ایک دلچسپ قصہ مجھ سے بیان فرمانے لگے:

"کہ اقبال ابھی ماں کے پیٹ میں تھا کہ میں نے ایک عجیب خواب دیکھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت خوشنما پرندہ سطح زمین سے تھوڑی

۱۔ (ا) آئینہ اقبال تالیف عبداللہ قریشی لاہور ص، ۲۵۴۔

(ب) مطالعۂ اقبال مرتب گوہر نوشاہی لاہور ص، ۳۶ - ۳۷

(ج) زندہ رود جلد اول تالیف جسٹس جاوید اقبال لاہور، ص ۶۰

(د) دانائے راز تالیف سید نذیر نیازی لاہور، ص ۲۵

(ہ) ماہنامہ ضیائے حرم، لاہور، اپریل ۱۹۷۵ء مضمون سید نور محمد قادری ص، ۴۳ - ۴۶

(و) ماہنامہ آئینہ لاہور، اپریل ۱۹۶۵ء مضمون سردار علی احمد خاں ص، ۴۳ - ۴۴

(ز) "محترمی و مکرمی سید نور محمد قادری صاحب

سلام مسنون۔ یہ بات ہمارے خاندان میں بیشتر کو معلوم ہے کہ حضرت علامہ کے والد حضرت قاضی سلطان محمودؒ کو آوان شریف اُن کی بیعت کے لیے لے گئے تھے جاوید اقبال ۱۰ مارچ ۱۹۸۰"

بلندی پر اُڑ رہا ہے اور بہت سے لوگ ہاتھ اٹھا کر اور اوچھل کر اُس کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ لیکن وہ کسی کی گرفت میں نہ آیا ۔ میں بھی اُن تماشائیوں میں کھڑا تھا اور خواہش مند تھا کہ غیر معمولی جمال کا یہ پرندہ میرے ہی ہاتھ آ جائے ۔ وہ پرندہ یک بیک میری آغوش میں آ گرا ۔ میں بہت خوش ہوا اور دیر تک منہ تکتے رہ گئے ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مجھے اس خواب کی تعبیر بتا ہوئی کہ پرندہ عالم روحانی میں پیدا ہونے والا بچہ ہے جو صاحب اقبال ہوگا''[1] ۔

خلیفہ عبدالحکیم ایک اور واقعہ حضرت علامہ کی زبانی بیان کرتے ہیں :

''میں نے والدہ کی زبانی سنا ہے کہ ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ والد کی موجودگی میں بے چراغ کمرے کے اندر تاریک رات میں عجیب و غریب قسم کا نور ظاہر ہوا ۔ اور تاریک کمرے میں ایسا معلوم ہوا کہ سورج نکل آیا ہے''[2] ۔

حضرت علامہ کے والد اگرچہ معمولی پڑھے لکھے تھے ۔ تصوف سے دل چسپی کی بنا پر اُن کے ہاں ایسے اصحاب کا اکثر اجتماع ہوتا جو صوفیائے کرام سے سچی عقیدت و محبت رکھتے تھے اور مجلس میں صوفیاء کرام کی تصنیفات مثلاً فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ وغیرہ پڑھی جاتیں اور اُن پر بحث ہوتی ۔ وہ اہل علم و فضل جو اس مجلس میں شریک ہوتے اُن میں ایک مولوی سید چراغ شاہؒ (راقم الحروف کے حقیقی دادا) بھی تھے جو گجرات سے آ کر کشمیری محلہ سیالکوٹ میں آباد ہو گئے تھے بڑے عالم ، فاضل اور سلسلۂ نقشبندیہ کے صاحب دل بزرگ تھے سید نذیر نیازی شاہ صاحب کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

''محمد اقبال نے اگرچہ صرف اتنا کہا ہے کہ اس حلقے میں کتب تصوف کا مطالعہ ہوتا لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ حلقہ کن بزرگوں پر مشتمل

۱۔ فکر اقبال تصنیف ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لاہور ، بار اول ۔ ص ، ۱۳ - ۱۵

۲۔ ''آثار اقبال'' مرتب غلام دستگیر حیدر آباد دکن ، طبع دوم ۱۹۴۶ء ، ص ۱۸

تھا ۔ اتنا معلوم ہے کہ ان میں ایک سید چراغ بھی تھے جو گجرات سے ترک وطن کرکے انہیں کے قریب محلہ کشمیریاں میں آباد ہوئے ۔ مولوی غلام مرتضیٰ جن کی میر حسن نے بہت تعریف کی ہے کے شاگرد تھے''۱۔

خوش قسمتی سے نوجوان اقبال کو استاد اور مربی بھی ایسا ملا جو اولیائے کرام کی محبت و عقیدت سے سرشار تھا ۔ عرس ، کرامت اور اولیاء کرام سے نذر و نیاز کا قائل تھا ۔ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین اپنی گراں مایہ تالیف ''شمس العلماء مولوی سید میر حسن'' میں فرماتے ہیں :

''آپ کے آباؤ اجداد مذہب پرست تھے ۔ سنت نبوی کے زندہ نمونہ تھے ۔ اس لیے آپ بھی اُسی نمونے کے انسان تھے ۔ اللہ والوں کی صحبت میں شریک ہو کر اُن کی اچھی اچھی باتوں سے مستفید اور مستفیض ہوا کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ بزرگوں کے مزاروں پر جا کر فاتحہ پڑھ کر اُن کے لیے خدا کی بخشش کے طلب گار ہوا کرتے ، وزیر آباد سے چار فرلانگ کے فاصلہ پر ایک سید بزرگ کا مزار تھا ، وہ بزرگ سید مٹھا شاہ کے نام سے مشہور تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بزرگ لاہور کے حضرت داتا گنج بخش کے مریدوں میں سے تھے ۔ اُن کے مزار پر بیساکھ میں عرس ہوا کرتا تھا ۔ میر صاحب اس عرس میں شریک ہوتے تھے ۔ وزیر آباد سے تبدیل ہو کر جب سیالکوٹ آئے تو یہاں آ کر بھی اس مزار کو نہیں بھولے اور اپنے دوستوں مولوی امام الدین گجراتی ، مولوی انشاء اللہ اور مولوی مراد علی ساکن بیگووال سے مل کر مشترکہ خرچ سے عرس کے موقع پر پلاؤ کی دیگ پکایا کرتے تھے''۲ ۔

مولانا سید میر حسن کے اپنے عہد کے مشاہیر صوفیائے کرام سے بھی تعلقات تھے ۔ ان بزرگوں میں سید کیسر شاہ۳ ساکن وائیں ضلع گوجرانوالہ بھی تھے۔ سید کیسر شاہ کا ایک دل چسپ واقعہ حضرت علامہ اقبال نے بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عام مولوی اور صوفی

۱۔ دانائے راز تصنیف نذیر نیازی لاہور ۱۹۷۹ء ، ص ۶۰

۲۔ شمس العلما مولوی میر حسن تالیف ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین لاہور ۱۹۸۱ء ، ص ، ۳۶

۳۔ ایضاً ، ص ، ۱۷۷

کے اندر تبلیغ میں کیا فرق ہے اور صوفی کی بات کیوں زیادہ مؤثر ہوتی ہے ۔ ممکن ہے کہ یہ واقعہ حضرت علامہ نے سید میر حسن ہی سے سنا ہو ملاحظہ ہو :

''ہمارے سیالکوٹ کے قریب تحصیل وزیر آباد میں ایک بزرگ کیسر شاہ نام کے رہا کرتے تھے ۔ رندانہ طریق کے ایک صاحب کرامت درویش تھے اور مراقبہ و وحدت الوجود سے انہیں خصوصیت تھی ۔ قرب و جوار کے تمام معززین ان کے حلقۂ مریدین میں شامل تھے ایک روز کا ذکر ہے کہ دیوان صاحب جو اُن کے معتقد تھے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی سے فارغ ہو کر حضرت کی زیارت کو آئے اور آتے ہی اپنے نام و نمود کا نقشہ اتارنا شروع کیا ۔ وہ بزرگ ان کے اخراجات کی طویل فہرست خموشی سے سن رہے تھے ۔ ایک درویش نے سائیں صاحب کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ حضرت کھانا تیار ہے ، سائیں صاحب نے پوچھا بھائی خشک روٹی ہے کہ ساتھ کوئی سالن بھی ہے ۔ درویش نے عرض کیا حضرت اس وقت سالن موجود نہیں ۔ حضرت نے دیوان صاحب سے فرمایا کہ ذرا بازار سے جا کر ایک مولی تو لے آؤ ۔ اتفاقاً دیوان صاحب کی جیب میں اس وقت کوئی پیسہ موجود نہیں تھا ، ذرا کھسیانے ہوئے اور سائیں صاحب کے سامنے جو چند کوڑیاں رکھی تھیں انہیں دیکھ کر بولے حضرت یہ کوڑیاں دلائیے ۔ میرے پاس اس وقت کچھ نہیں ۔

آپ نے فرمایا : بیٹے کی شادی پر جو تم نے نام و نمود حاصل کیا ہے وہ دے کر ایک مولی لے آؤ ۔ دیوان صاحب مسکرائے اور کہنے لگے:

بھلا حضرت نام و نمود کے عوض بھی کوئی کھانے پینے کی چیز ہاتھ آ سکتی ہے ! سائیں صاحب نے اپنے معمولی ظریفانہ طریق میں کہا کہ بھائی جس نام و نمود کی قیمت ایک مولی بھی نہیں پڑی اُس کے حصول سے کیا فائدہ ۔ دیوان صاحب نہایت خفیف ہوئے اور آئندہ کے لیے اپنی حرکات سے توبہ کی''[1] ۔

مولانا سید میر حسن سے حضرت علامہ کو تمام عمر گہری عقیدت رہی ہے یہاں تک کہ ۱۹۰۵ء میں یورپ جاتے ہوئے جب علامہ

۱۔ مقالاتِ اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی لاہور ، ص ، ۵۹

خواجہ نظام الدین اولیاء کے دربار پر انوار پر حصول برکات کے لیے حاضر ہوئے اور منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا تو وہاں بھی آپ کو نہیں بھولے اور بڑی عقیدت سے اُن کا ذکر ہے ۔ ملاحظہ ہو :

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسماں و زمیں
کرے پھر اُس کی زیارت سے شادماں مجھ کو[1]

مولانا سید میر حسن میں بے شمار خوبیوں کے علاوہ جو سب سے بڑی خوبی تھی وہ اُن کی "استقامت" تھی جس بات کا ارادہ کر لیتے یا وعدہ کر لیتے اُسے ہر حالت میں نبھانے کی کوشش کرتے ۔ اُن کی استقامت کا ایک واقعہ مولانا عبدالمجید سالک اس طرح بیان کرتے ہیں :

"ابھی شاہ صاحب کا عالم شباب ہی تھا کہ اُن کی ہمشیرہ سخت بیمار ہو گئیں یہاں تک کہ بچنے کی کوئی صورت نہیں رہی ۔ ایک دن شاہ صاحب اُن کے پاس بیٹھے تھے ، آبدیدہ ہوئیں اور کہنے لگیں کہ بس اب میں مر جاؤں گی اور کوئی میری قبر پر بھی نہ آئے گا ۔ شاہ صاحب بھی آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا : اللہ تمہیں شفا دے لیکن اگر کوئی حرج مرج ہوگیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک جیوں گا تمہاری قبر پر آیا کروں گا ۔ ہمشیرہ کا انتقال ۱۸۷۸ء میں ہوا اور شاہ صاحب کی بینائی ۱۹۲۸ء میں یعنی انتقال سے دو سال پہلے زائل ہوگئی ۔ اس پچاس سال کی مدت میں اُن کا مستقل یہ معمول رہا کہ روزانہ صبح کے وقت ہمشیرہ کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتے ۔ سوائے اُن دنوں کے کہ شاہ صاحب کو سیالکوٹ ہی سے باہر جانا پڑا ہو اس معمول میں ایک دن بھی ناغہ نہ ہوا"[2] ۔

اس قسم کی استقامت کی ایک اور مثال میرے عم مرحوم سید ظہوراللہ شاہ صاحب سیالکوٹی کی زندگی میں بھی ملتی ہے ۔ والدہ کی وفات کے وقت وہ

۱- "کلیات اقبال حصہ اردو" بانگ درا ، ص ۹۷

۲- ذکر اقبال تالیف عبدالمجید سالک لاہور ص ، ۲۷۵ - ۲۷۶

اکیلے ہی اُن کے پاس موجود تھے ۔ مرنے سے تھوڑی دیر پہلے والدہ نے اُن سے وعدہ لیا کہ وہ ہر روز گیارہ مرتبہ سورۂ یٰسین پڑھ کر اُن کی روح کو ایصال ثواب کیا کریں گے ۔ اس وعدہ کو انہوں نے بڑے استقلال سے نبھایا ۔ وہ ۱۹۳۶ء میں فوت ہوئے اور سیدنا شاہ سرمست سہروردیؒ (پیر و مرشد حضرت شاہ دولہ ولیؒ) کی درگاہ واقع سیالکوٹ میں دفن ہوئے ۔

(۲)

حضرت علامہ بزرگان دین کی وفات کے بعد بھی اُن سے استعانت اور اُن کے مزاراتِ متبرکہ سے فیوض و برکات حاصل کرنے کے قائل تھے ۔ ۱۹۰۳ء میں جب اُن کے بڑے بھائی شیخ عطاء اللہ پر ایک افتاد پڑی تو انہوں نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے حضور منظوم استغاثہ پیش کیا ۔ جسے خوش خط لکھوا کر درگاہ کے دروازہ پر لٹکایا اور اس استغاثہ کی برکت شیخ عطاء اللہ باعزت طور پر بری ہوئے ۔ اس استغاثہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

"کیوں نہ ہوں ارماں میرے دل میں کلیم اللہ کے
طور در آغوش ہیں ذرے تیری درگاہ کے
ہے زیارت کی تمنا ۔ المدد اے سوز عشق
پھول لا دے مجھ کو گلزار خلیل اللہ کے
کس قدر سرسبز ہے صحرا محبت کا تری
اشک کی نہریں ہیں اور سائے ہیں نخلِ آہ کے
تر جو تیرے آستانے کی تمنا میں ہوئی
اشک موتی بن گئے چشم تماشاہ خواہ کے
میرے جیسے ، بے نواؤں کا بھلا مذکور کیا ؟
قیصر و فغفور درباں ہیں تیری درگاہ کے
ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربار گوہر بار سے
سخت ہے میری مصیبت ، سخت گھبرایا ہوں میں
بن کے فریادی تری سرکار میں آیا ہوں میں

کیمیا سے بھی فزوں تر تیری خاک در مجھے
ہاں عطا کر دے میرے مقصود کا گوہر مجھے
تو ہے محبوب الٰہی کر دعا میرے لیے
یہ مصیبت ہے مثالِ فتنۂ محشر مجھے
آہ اس غم میں اگر تو نے خبر میری نہ لی
غرق کر ڈالے گی آخر کو یہ چشم تر مجھے
ہو اگر یوسف مرا زحمت کشِ چاہ الم
چین آئے مصرِ آزادی میں پھر کیوں کر مجھے
کیا کہوں میں قصۂ ہمدردی اہل وطن ؟
تیر کوئی بھیجتا ہے اور کوئی نشتر مجھے
محوِ اظہار تمنائے دلِ ناکام ہوں !
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال[1] کا ہم نام ہوں''[2]

۱۹۰۵ء میں حضرت علامہ اعلیٰ تعلیم کے لیے عازم یورپ ہوئے تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ پر حاضر ہوئے اور اپنا ہدیۂ عقیدت ایک نظم بعنوان ''التجائے مسافر'' میں پیش کیا یہ نظم پہلی دفعہ ماہنامہ ''مخزن'' کے اکتوبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی اور اس کے شروع میں جناب سید غلام بھیک نیرنگ نے ایک تمہید لکھی جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے ۔

''۲ ستمبر ۱۹۰۵ء ہمارے خاص احباب کی تاریخ محبت کا ایک یادگار دن ہے ۔ صبح کا سہانا سماں ہے ، بمبئی میل دہلی سے ریلوے سٹیشن پر پہنچی ہے ۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی اور منشی نذر محمد بی ۔ اے اسٹیشن پر استقبال کو آئے ۔ استقبال کس کا ہے ، جدید شاعری کے روح رواں اقبال اور اُس کے ہمراہیوں کا ۔ وہ کیسے ؟ اقبال بغرض تعلیم علوم و فنون انگلستان کو روانہ ہوئے ہیں ۔ نیرنگ اور اکرام اپنے پیارے دوست کو رخصت کرنے کے لیے دہلی تک ساتھ گئے ہیں ، ریل سے اتر کر

۱۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خادم کا نام
۲۔ رخت سفر مرتبہ انور حارث بار دوم کراچی ۱۹۷۷ء ص ۱۶۱ تا ۱۶۶

منشی نذر محمد کے مکان پر تھوڑی دیر آرام کیا بعد میں سب دوست مل کر حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء قدس سرہ کی درگاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ درگاہ میں پہنچ کر مزار مبارک پر حاضر ہوئے۔ اول اقبال نے عالم تنہائی میں مزار مبارک کے سرہانے بیٹھ کر ذیل کی نظم پڑھی اور اُن کی درخواست پر سب احباب باہر صحن میں ٹھہرے رہے۔ بعد میں دوستوں کے اصرار پر اقبال نے اس نظم کو درگاہ کے صحن میں بیٹھ کر مزار مبارک کی طرف منہ کر کے ایک نہایت درد انگیز اور دل نشیں لہجے میں پڑھا۔ سب احباب اور دیگر سامعین نہایت متاثر ہوئے اور بے تحاشہ زبان سے موقع بہ موقع کلمات تحسین و آفرین نکلتے تھے، ایک محویت کا عالم تھا جس کی تصویر حاضرین کے تصور ہی کھینچ سکتے ہیں''[1] ۔ اب ''التجائے مسافر'' کے چند اشعار ملاحظہ کریں :

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھ کو
مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھ کو

۱۔ رسالہ برگ گل کراچی اقبال نمبر ۱۹۷۷ء مضمون عابدہ سلطانہ مرزا، ص ۲۰۳

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے[۱]

یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد علامہ جب وطن واپس لوٹے تو پھر دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے دربار پر انوار میں[۲] سلام کے لیے حاضر ہوئے۔

۱۹۱۱ء میں دہلی میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے حضرت علامہؒ نے فرمایا:

''میں جب کبھی دہلی آتا ہوں تو میرا یہ دستور رہا ہے کہ ہمیشہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے مزار پر جایا کرتا ہوں اور وہاں کے دیگر مزارات پر بھی ہمیشہ حاضر ہوا کرتا ہوں''[۳]۔

ایک دفعہ خواجہ حسن نظامی کو نیاز کی رقم بھیجی اور لکھا:

''یہ نیاز جو آپ کو پہنچی ہے۔ والدہ محترمہ کی نیاز تھی، قبول فرمائیے۔ بھائی صاحب کا ارادہ خود حاضر ہونے کا تھا مگر شاید انہیں فرصت نہ تھی''[۴]۔

ایک دفعہ حضرت علامہؒ نے نیاز کے بارہ روپے ارسال کیے اور خواجہ صاحب کو لکھا۔

''مکرمی بارہ روپے جس طرح آپ کے خیال میں آئے خرچ کر دیجئے حلوہ پکا دیجئے یا خانقاہ کے متعلقین میں تقسیم کر دیجئے''[۵]۔

(۳)

حضرت علامہؒ تحصیل علم کے لیے لاہور آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے اور آخر داتا کی نگری ہی میں اُن کی آرام گاہ بنی۔ چالیس (۴۰)

۱- کلیات اقبال حصہ اردو، بانگ درا، ص ۹۶ تا ۹۷
۲- ایضاً۔ ص، ۴۰۷
۳- مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی لاہور ۱۹۶۳ء۔ ص، ۱۴۴
۴- اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ دوم ص، ۳۶۰
۵- ایضاً ص، ۳۶۴ - ۳۶۵

سالہ قیام کے دوران وہ سینکڑوں دفعہ اولیائے کرام کے مزارات عالیہ پر حاضر ہوئے ہوں گے ۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس معلومات بہت کم ہیں ۔ ہاں یہ ثابت ہے کہ وہ حضرت داتا گنج بخشؒ ، حضرت میاں میرؒ اور حضرت شاہ محمد غوثؒ کے مزارات مقدسہ پر تمام عمر باقاعدگی سے حاضر ہوتے رہے حضرت علامہؒ علی ہجویریؒ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

سید ہجویر مخدوم امم — مرقد او پیر سنجر را حرم
بندہائے کوہسار آساں گسیخت — در زمین ہند تخم سجدہ ریخت
عہد فاروقؓ از جمالش تازہ شد — حق ز حرف او بلند آوازہ شد
پاسبان عزت ام الکتاب — از نگاہش خانۂ باطل خراب
خاک پنجاب از دم او زندہ گشت — صبح ما از مہر او تابندہ گشت[۱]

جناب میاں ایم ۔ اسلم نے "راوی" کے اقبال نمبر اور فقیر سید وحید الدین مرحوم نے روزگار فقیر جلد اول میں دو ایسے واقعات درج کیے ہیں جو حضرت داتا گنج بخشؒ کے ساتھ حضرت علامہؒ کی عقیدت پر ہی مبنی نہیں بلکہ حضرت علی ہجویریؒ کی کرامات میں بھی شامل ہو سکتے ہیں ۔

میاں ایم ۔ اسلم حضرت علامہؒ کی زبانی بیان کرتے ہیں :

"آپ نے فرمایا کہ حضرت گرامی آئے ہوئے تھے اور حسب دستور میرے پاس مقیم تھے ۔ ایک روز ہم دونوں صبح صبح گھر سے نکل کر حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کو چلے ، بھاٹی دروازہ کے باہر ایک سفید ریش آدمی ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا ۔ میری جیب میں ایک چونی تھی ، میں نے وہ چونی اُس کے ہاتھ پر رکھ دی ، لیکن اُس نے چونی زمین پر پھینک دی اور ایک روپیہ مانگا ، مانگنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میرا قدم آگے کو نہ بڑھا ۔ میں نے گرامی صاحب نے کہا کہ آپ دربار کو چلیے میں آپ کے پیچھے پیچھے پہنچتا ہوں ۔ گرامی صاحب نے کہا کہ وہ اسی جگہ میرا انتظار کریں گے ۔ گھر دروازے کے قریب ہی تھا ۔ میں نے گھر سے ایک روپیہ لیا اور واپس آ کر اُس

۱۔ کلیات اقبال حصہ فارسی ، اسرار و رموز ، ص ۵۲

فقیر کو دے دیا ، اُس نے دعا دی پھر میں اور گرامی حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر جا پہنچے ۔ یہاں ہم کچھ دیر ٹھہرے اور فاتحہ پڑھ کر گھر واپس لوٹ آئے ۔ اُسی روز میرے منشی طاہر نے مجھے پانچ سو روپے کا نوٹ دیا اور کہا کہ ایک مقدمے والا آیا تھا اور وہ یہ پانچ سو روپے آپ کی فیس دے گیا ہے ۔ حضرت گرامی جو میرے پاس بیٹھے تھے بولے ڈاکٹر صاحب لیجیے آپ کو ایک کے پانچ سو مل گئے''[۱]

فقیر سید وحیدالدین اپنے والد مکرم کی زبانی ایک واقعہ اس طرح بیان فرماتے ہیں :

''کل صبح میں اقبال کے ہاں گیا تو گویا میرے منتظر تھے ۔ دیکھتے ہی کھل گئے اور کہا اچھا ہوا فقیر تم آ گئے ، سنا ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ کی درگاہ میں آج کل کوئی بہت روشن ضمیر بزرگ قیام رکھتے ہیں ۔ اُن سے ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں ۔ سوال یہ ہے کہ جب مسلمانوں سے یہ وعدۂ ایزدی ہے کہ وہ اقوام عالم میں سرفراز اور سر بلند ہوں گے تو آج کل یہ قوم اتنی ذلیل و خوار کیوں ہے ۔ اچھا ہے تم بھی ساتھ چلو ، اکیلے زحمت کون کرے ۔ میں نے حامی بھری اور چلنے کی تیاریاں شروع کر دیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ داتا گنج بخش کے سفر کا فیصلہ ہوتے ہی انہوں نے علی بخش کو آواز دی اور کہا دیکھو ہم باہر جا رہے ہیں ۔ ذرا جلدی سے فقیر کے لیے حقہ بھرو اور بھاگ کر کچھ سوڈا لیمن وغیرہ لے آؤ ۔ اس اہتمام میں حسب معمول جانے کتنا وقت نکل گیا ۔ جب صبح سے دوپہر ہوگئی تو میں نے کہا بھئی اقبال تمہارا کہیں جانے کا ارادہ تو ہے نہیں یوں ہی وقت ضائع کر رہے ہو ، میں تو اب گھر چلا ! اقبال اس پر کچھ چونک سے پڑے اور کہا بھئی اب تو واقعی دھوپ تیز ہوگئی ہے ، تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ لیکن یہ وعدہ کرو شام کو ضرور آؤ گے کچھ بھی ہو ہمیں اُن بزرگ کے پاس ضرور جانا ہے ۔ میں وعدہ کر کے چلا آیا ، سہ پہر کو پھر پہنچا لیکن پھر اسی طرح حقہ اور سوڈا لیمن میں دن ڈھل گیا ۔ میں نے اقبال سے اس تساہل کا ذکر کیا تو اقبال بہت ہی انکسار سے کہنے لگے ، بھئی اس دفعہ معاف کر دو صبح ضرور چلیں گے ۔

۱۔ راوی اقبال نمبر اپریل ۱۹۷۳ء مضمون میاں ایم ۔ اسلم ، ص ۹

اگلی صبح میں عمداً دیر سے پہنچا ، گیارہ بجے کا وقت ہوگا اقبال کو دیکھا تو ان کی عجیب کیفیت تھی ، رنگ زرد ، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ، تفکر اور اضطراب کا یہ عالم کہ جیسے کوئی شدید سانحہ گذر گیا ہو ۔ میں نے پوچھا خیر تو ہے ۔ کہنے لگے فقیر میرے قریب آ کر بیٹھو تو کہوں ۔ آج صبح میں یہیں بیٹھا تھا کہ علی بخش نے آ کر اطلاع دی کہ کوئی درویش صورت آدمی ملنا چاہتا ہے ۔ تو میں نے کہا بلا لو اور ایک درویش صورت اجنبی میرے سامنے خاموش آ کھڑا ہوا ، کچھ وقفہ کے بعد میں نے کہا فرمائیے ۔ آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے ۔ اجنبی بولا : ہاں تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے ۔ میں تمہارے سوال کا جواب دینے آیا ہوں اور اُس نے مثنوی کا یہ مشہور شعر پڑھا :

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
تو ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

کچھ پوچھو نہیں مجھ پر کیا گزر گئی ۔ چند لمحوں کے لیے مجھے قطعی اپنے گرد و پیش کا احساس جاتا رہا ۔ ذرا حواس ٹھکانے ہوئے تو بزرگ سے مخاطب ہونے کے لیے دوبارہ نظر اٹھائی ، لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا ۔ علی بخش کو ہر طرف دوڑایا لیکن کہیں سراغ نہ ملا''[۱] ۔

آخری عمر میں تو حضرت علامہ فنا فی الگنج بخش ہو کر رہ گئے تھے ۔ ان دنوں میں ایک تو وہ ''کشف المحجوب'' کا بہ کثرت مطالعہ کرتے اور دوسرے ۱۹۳۶ء سے لے کر اُس وقت تک جب کہ چلنے پھرنے سے بالکل معذور ہو گئے ہر روز صبح کی نماز اپنے عزیز دوست ڈاکٹر نیاز احمد کی ہمراہی میں حضرت داتا گنج بخشؒ کی درگاہ میں ادا کرتے رہے اور معمول میں کبھی ناغہ نہ ہوا ۔ ہاں اگر وہ لاہور سے باہر گئے ہوں تو علاوہ بات ہے ۔ ڈاکٹر نیاز احمد سابق ڈائریکٹر انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی پنجاب یونیورسٹی کی نواسی محترمہ شہناز امین ایک مضمون میں بیان کرتی ہیں ۔

''نانا مرحوم ایک بات کا جس کا وہ خاص طور پر ذکر کرتے تھے وہ علامہ اقبالؒ کی حضرت داتا گنج بخشؒ کے لیے عقیدت تھی ۔ ایک بار

---

۱ - ''روزگار فقیر'' جلد اول تالیف فقیر سید وحیدالدین طبع ششم لاہور ۱۹۶۶ء ، ص ۳۲ - ۳۳

جب علامہؒ صاحب سے ملاقات کے لیے جاوید منزل گئے تو علامہ اقبال ''کشف المحجوب'' کا مطالعہ کر رہے تھے ۔ نانا کو دیکھتے ہی پرنم آنکھوں سے بولے ! دیکھو ڈاکٹر نیاز یہ کتاب نہیں یہ توگنجینۂ معنی ہے۔ کیا خوبصورت پیغام کتنے سادہ لفظوں میں دیا گیا ہے مگر سمجھ نہیں آتی مسلمان اس قدر بے حس کیوں ہو گیا ہے ۔ واللہ اگر ہم آج بھی داتا صاحب کے تصوف کی گہرائی اور گیرائی سمجھ لیں تو اسلام کو سمجھنے میں دقت ہی کچھ نہیں رہ جاتی !

نانا مرحوم کہتے ہیں ۲۲ فروری ۱۹۳۶ء سے لے کر نومبر ۱۹۳۷ء تک یہ دستور رہا کہ میں صبح تین بجے کا الارم لگا کر سوتا ۔ ۳ بجے گاڑی لے کر سیدھا جاوید منزل پہنچتا ۔ پہلے ہی ہارن پر حضرت علامہؒ تشریف لے آتے ۔ ہم دونوں نماز فجر داتا صاحبؒ میں ادا کرتے ۔ علامہ قرآن کا نصف سیپارہ تلاوت کرتے اور اُجالا ہونے پر میں انہیں اُن کی اقامت گاہ پر چھوڑ کر واپس آتا ۔ اس معمول میں اندھیرے سویرے ، گرمی ، سردی ، برسات میں کبھی فرق نہیں پڑا ۔ نومبر ۱۹۳۷ء کے آغاز میں جوڑوں کے درد کے باعث چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے جس سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا''[۱] ۔

یہاں حضرت داتا صاحبؒ کی کرامت کا ایک اور واقعہ بھی درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا ۔ یہ واقعہ مجھے پنجابی زبان کے عظیم غزل گو پیر فضل حسین فضل نے مجھے سنایا تھا ۔ واقعہ یوں ہے ۔

''پیر صاحب نے بیان کیا کہ ایک دفعہ میں لاہور میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ داتا صاحب جا رہا تھا ۔ جب لوہاری دروازہ کے چوک میں پہنچا تو میرے دوست نے ایک معمر شخص کی طرف جو سرمہ بیچ رہا تھا اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ شخص حضرت داتا صاحبؒ کی زندہ کرامت ہے ۔ میں نے پوچھا وہ کیسے ؟ میرے دوست نے کہا چلو اس شخص سے پوچھتے ہیں ۔ چنانچہ ہم دونوں اُس کے پاس پہنچے اور اس سے حضرت داتا کی کرامت کو تفصیل سے بیان کرنے کے لیے عرض کیا تو اس نے کہا کہ میں آج سے ۲۵ ، ۳۰ سال پہلے بالکل اپاہج تھا لیکن

۱- روز نامہ ''نوائے وقت'' لاہور اقبال نمبر ۲۱ اپریل ۱۹۸۲ء

جمعۃ المبارک ہمیشہ داتا صاحب ہی میں ادا کرتا ۔ میرے بچے مجھے نماز سے پہلے پہنچا آتے اور نماز ختم ہونے کے بعد واپس گھر لے آتے ۔ ایک دفعہ جب اقامت کہی جا رہی تھی تو میرے ساتھ کھڑے ہوئے ایک نورانی صورت بزرگ نے کہا تم کھڑے کیوں نہیں ہوتے ۔ میں نے عرض کیا کہ میں اپاہج ہوں ۔ یہ سن کر بزرگ نے زور سے میرا بازو پکڑا اور کہا اٹھو تم بالکل ٹھیک ہو ۔ اُس کے بازو پکڑنے کی دیر تھی کہ میں تندرست و توانا آدمی کی طرح کھڑا ہو گیا ۔ جب فرائض کی ادائیگی کے بعد سلام پھیرا تو باوجود تلاش کے وہ آدمی نظر نہ آیا ۔ اُس وقت سے آج تک بالکل تندرست ہوں ۔ سرمہ بیچ کر عزت کی روٹی کھاتا ہوں ہاں اُس محسن کو ابھی تک آنکھیں تلاش کر رہی ہیں" ۔

(نوٹ : پیر صاحب نے یہ واقعہ مجھے ۱۹۶۳ء میں سنایا تھا)

(۴)

حضرت علامہؒ دست غیب ، بخشش ، درگاہوں پر منت ماننے وغیرہ کے بھی قائل تھے ۔ علامہ کے ایک عزیز دوست ڈاکٹر سعید اللہ تحریر فرماتے ہیں ۔

"دست غیب سے متعلق ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مولانا وحید الدین سلیم نے بارہا بیان کیا کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوگیا ۔ تو ان کے پیر حضرت غوث علی شاہ قلندرؒ نے مولانا وحید الدین سلیم کو بلایا اور کہا کہ تمہارا باپ ہمارا دوست تھا ہم تمہیں ایک وظیفہ بتا دیتے ہیں ۔ جب روپیہ کے حصول کی اور کوئی صورت نہ ہو تو اس وظیفہ کو پڑھنا ۔ پانچ روپے تمہیں مل جایا کریں گے ۔ پیر صاحب سے رخصت ہو کر گھر آئے تو والدہ کو سارا قصہ سنایا ۔ انہوں نے کہا کہ گھر میں کچھ نہیں نہ آٹا نہ دال ۔ وظیفہ پڑھا گیا ۔ تکیہ کے نیچے سے پانچ روپے مل گئے مولانا کا بیان ہے کہ انہوں نے اسی طرح وظیفہ پڑھ کر تعلیم حاصل کی ، جب روپیہ خود کمانے لگے تو وظیفہ بند کر دیا ۔ سرسید سے جب مولانا کی ملاقات ہوئی تو مولانا نے کہا کہ آپ نیچری ہیں مگر ہمارے وظیفہ کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں ۔

کرامت کی بھی ایک مثال ڈاکٹر صاحب نے سنائی ، فرمایا : سرسید کی

طرح اُن کے باپ کے گلے میں بھی رسولی تھی - وہ اپنے پیر کے پاس گئے اور کہا کہ حضرت مجھے رسولی کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے اس کا کیا کچھ علاج کیا جائے - پیر صاحب نے اُن کی داڑھی کے نیچے ہاتھ بڑھایا اور فرمایا بھئی ہمیں تو رسولی کہیں نظر نہیں آتی -

بخشش کی بھی مثال سنائی ، فرمایا : ایک انسپکٹر پولیس ہے وہ سانپ کے کاٹے کا دم کرتا ہے اور شفا ہو جاتی ہے - کئی سو میل سے بھی دم کا اثر ہوتا ہے''[۱] -

یہاں یہ عرض کر دوں کہ سر سید احمد خاں کے پوتے اور حضرت علامہ کے قریبی دوست سر راس مسعود مرحوم بھی اولیاء کرام سے سچی عقیدت رکھتے تھے اور اولیاء کرام کی کرامات کے صدق دل سے قائل تھے - انہوں نے ایک دفعہ ایک صاحب مزار کی کرامت کا ایک واقعہ مولانا عبدالرزاق کانپوری مصنف ''یاد ایام'' کو سنایا جو مولانا نے اس طرح بیان کیا ہے -

''ایک دفعہ بیان کیا کہ میں اورنگ آباد میں بحیثیت ناظم تعلیمات دورے پر تھا - شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک ولی کامل کا مزار تھا - میں وہاں فاتحہ پڑھنے گیا - مقبرے کے اندر سے جب واپس ہوا تو آواز آئی مسعود ! مقبرے کے سامنے جو درخت ہے اُس کی تین پتیاں کھاؤ - میں یہ سمجھا کہ کسی دوست نے مذاقاً یہ کہا ہے - لیکن جب غور سے دیکھا تو دور تک کوئی نظر نہ آیا ، کچھ فاصلے پر کار موجود تھی ڈرائیور سے پوچھا تو اُس نے کہا میرے سوا یہاں کوئی نہیں ہے ، چنانچہ اس غیبی آواز پر میں نے عمل کیا اور تین پتیاں اُس درخت کی توڑ کر کھا لیں - وہ زمانہ تھا کہ حیدر آباد کے بعض مقتدر اصحاب میرے مخالف ہو گئے تھے اور میں حقیقت میں تین مشکلوں میں مبتلا بھی تھا ، چنانچہ وہ سب مشکلیں حل ہو گئیں - اس واقعہ کے اظہار کے بعد حاضرین سے خطاب کیا کہ آپ لوگوں کو یہ واقعہ عجیب و غریب معلوم ہو گا اور میری بات غلط سمجھیں گے - لیکن یاد رکھئے میں نے کبھی جھوٹ

۱- ملفوظات اقبال مرتب محمود نظامی بار دوم ، لاہور ۱۹۴۹ء ص ۱۶۳ - ۱۶۴ -

نہیں بولا اور میں صوفیائے عظام کی کرامات کا معتقد ہوں''[۱]

حضرت علامہ کرامات اور نذر و نیاز کے علاوہ عام خوش عقیدہ مسلمانوں کی طرح دم درود ، تعویذ اور اولیاء کرام کی درگاہوں کی منت ماننے کے بھی قائل تھے ۔ جب وہ مدت تک اولاد کی نعمت سے محروم رہے تو حضرت مجدد کی درگاہ پر حاضر ہوئے اور دعا کی مولائے کریم مجھے بیٹا عطا فرما ۔ میں اُسے سلام کے لیے حضرت مجدد کی درگاہ پر لاؤں گا ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت علامہ کی درد بھری التجا سن لی اور جاوید عطا فرمایا ۔ اور جب جاوید کچھ بڑا ہوا تو اُسے سلام کے لیے سرہند تشریف لے گئے ۔ جاوید اقبال اپنے ایک مضمون ''ابا جان'' میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

''مجھے اپنے خاندان سے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ میری پیدائش سے کئی سال پیشتر ابا جان حضرت مجدد کی بارگاہ میں حاضر میں ہوئے اور دعا کی کہ اللہ انہیں ایک بیٹا عطا کرے ۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے اپنے ساتھ لے کر دوبارہ سرہند پہنچے ۔ اُس سفر کے دھندلے سے تصورات میری نگاہوں کے سامنے ابھرتے ہیں ۔ میں اُن کے ہمراہ اُن کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہو رہا ہوں ۔ گنبد کے تیرہ و تار مگر پُر وقار ماحول نے مجھ پر ایک ہیبت طاری کر دی ، ابا نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا ، پھر انہوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ منگوایا اور دیر تک پڑھتے رہے ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے دیکھا اُن کی آنکھوں سے آنسو امڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں ۔ دو ایک روز وہاں ٹھہرنے کے بعد ہم گھر واپس آ گئے ''[۲]

سرہند شریف کے اس سفر میں مولانا غلام بھیک نیرنگ بھی علامہ کے ہمراہ تھے ۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں ۔

''اسرار خودی'' کے شائع ہونے پر اُن کو تصوف اور سلسلہ ہائے تصوف کا مخالف سمجھا گیا ۔ مگر اُن کے کلام کے وسیع مطالعہ سے یہ بات

۱۔ یاد ایام تالیف عبدالرزاق کانپوری حیدر آباد دکن ۱۹۴۶ء ص ۳۷۷—۳۷۸ ۔

۲۔ ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی بار دوم لاہور ۱۹۴۹ء ص ۳۲۲ - ۳۲۳ ۔

واضح ہو جاتی ہے کہ اُن کا اعتراض ریاکار، دکاندار اور دنیا طلب صوفیوں پر ہے، اُن کے والد ماجد ایک صوفی منش بزرگ تھے، خود اقبال سلسلۂ قادریہ میں بیعت کئے ہوئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ بزرگوں کے مزارات پر بالقصد بغرض زیارت و طلب برکت حاضر ہوا کرتے تھے ۔ بانگ درا میں اُن کی نظم ''التجائے مسافر'' کو دیکھیے اس سے حضرت محبوب الٰہیؒ سے انتہائی عقیدت ظاہر ہوتی ہے، یہ اقبال کی جوانی کا واقعہ ہے ۔ لیکن بالفرض اگر یہ جوانی کی خام کاری تھی تو بعد کی پختہ کاری قابل غور ہے ۔ اس پختہ کاری ہی کے زمانے میں غالباً ۱۹۳۴ء میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے مزار پاک کی زیارت کے لیے اقبال لاہور سے چل کر سرہند آئے، مجھ کو لکھا کہ میں بھی پہنچوں ۔ چنانچہ انبالے سے گیا اور وہ لاہور سے آئے، ہم دونوں سرہند جنکشن پر مل گئے اور پھر روضہ شریف پہنچے ۔ مزار پر اقبال کی حاضری میرے ہمراہ ہوئی اور فاتحہ خوانی کے بعد دیر تک وہ مراقبہ میں رہے ۔ ان کا لاہور سے اتنی دور چل کر آنا ہی ثابت کرتا ہے کہ اُن کو حضرت مجدد سے کس قدر عقیدت تھی ''[۱]

حضرت علامہ مریضوں کو تعویز اور گنڈا بھی دیتے ۔ جاوید اقبال فرماتے ہیں ۔

''بعض اوقات خود اقبال بھی بخار کے مریضوں کو پیپل کے پتوں پر قرآنی آیات قلم سے لکھ کر دیتے تھے ۔ جس کے چاٹنے سے مریض کا بخار اُتر جاتا تھا ۔ اپنے بچپن میں راقم نے انہیں پیپل کے پتوں پر ایسا تحریر کرتے دیکھا ہے ۔ اس قسم کے روحانی علاج کرنے کی اجازت ممکن ہے انہوں نے اپنے والد سے حاصل کی ہو''[۲]

حضرت علامہ آیات قرآنی کی تاثیر کے سختی سے قائل تھے ۔ ایک دفعہ علامہ راغب احسن کا خاندان مصائب و آلام کا شکار ہو گیا تو انہیں لکھا :

۱۔ سہ ماہی ''اقبال'' لاہور اکتوبر ۱۹۵۷ء مضمون غلام بھیک نیرنگ، ص ۲۰ ۔ ۲۱ ۔

۲۔ زندہ رود تالیف جاوید اقبال لاہور ۱۹۷۹ء جلد اول ص ۔ ۶۴

''میں آپ کی مدد کے لیے حاضر ہوں - سورۃ الرحمٰن کا ورد ہر روز کرنا چاہیے - گھر کے سب لوگ پڑھا کریں تو اور بھی بہتر''[۱]

درود شریف کو تو علامہ اقبالؒ اکسیر اعظم سمجھتے تھے اور ہر وقت اُن کے لب اس ذکر پاک سے تر رہتے اور جس کسی کو بھی کسی مشکل یا الجھن میں مبتلا دیکھتے اُسے درود شریف بکثرت پڑھنے کی تاکید کرتے -

(۵)

حضرت علامہ خود بھی مستجاب الدعوات اور صاحب کرامت بزرگ تھے - ایک دفعہ اُن کے ایک عقیدت مند ڈاکٹر عبدالحمید ملک اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری شادی کو بہت عرصہ گزر چکا ہے لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں دعا فرمائیں ! چنانچہ آپ کی دعا سے ڈاکٹر عبدالحمید اولاد کی نعمت سے سرفراز ہوئے - اس واقعہ بلکہ کرامت کو ملک صاحب کی زبانی سنیے -

''میری شادی کو تقریباً بارہ برس گذر گئے لیکن ہمارے ہاں کوئی اولاد نہ تھی جس کی وجہ سے میں اکثر مغموم رہتا - اُن دنوں شاعر مشرق کے ہاں میرا اکثر آنا جانا رہتا تھا اور آپ مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے - ایک روز میرے دوست میاں محمد شفیع (م - ش) نے علامہ مرحوم سے کہا کہ حمید صاحب کے لیے دعا کیجیے کہ ان کو بھی اللہ تعالیٰ اولاد کی نعمت سے سرفراز فرما دے اور اُن کی اداسی ختم ہو جائے فرمایا :- اچھا بھائی کریں گے ! دوسرے روز میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ہم نے تمہارے لیے دعا کر دی ہے اور زندگی میں اتنی شدت سے ایک دفعہ پہلے دعا کی تھی یا اب تمہارے لیے کی ہے - انشاء اللہ خدا اپنا فضل کرے گا - اپنی بیوی سے کہنا کہ صبح کی نماز کے بعد روزانہ سورۃ مریم کی تلاوت کیا کرے - چنانچہ میری بیوی حسب ہدایت سورۃ مریم کی تلاوت کرتی رہیں اور اللہ تعالیٰ نے نو دس ماہ بعد ہمیں ایک فرزند عطا فرمایا -

---

۱- روز نامہ ''جنگ'' لاہور اقبال نمبر ۲۱ اپریل ۸۳ مکتوب بنام علامہ راغب احسن -

حضرت علامہ کے مندرجہ ذیل مصرعوں کا بھی مطالعہ کیا جائے :

ع مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم (علی ہجویری کی تعریف میں)

ع در فضائے مرقدِ او سوختم (حکیم سنائی کی یاد میں)

ع تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
(حضرت نظام الدین اولیاء کی یاد میں)

تو ایک عجیب نقطہ سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت علامہ نہ صرف اولیاء کرام کی ذات اور اُن کی ارواح مقدسہ کو محیطِ انوار سمجھتے ہیں بلکہ اُس خاک کو بھی مرکزِ تجلیات سمجھتے ہیں جہاں یہ پاک نفوس آرام فرما رہے ہوتے ہیں ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ''مرقد او پیر سنجر را حرم'' نہ کہتے بلکہ مرقد کی بجائے ذات یا روح کا لفظ استعمال کرتے ۔

اس مثنوی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں حضرت علامہؒ نے اپنی فکری اور روحانی دنیا کے ہونے والے رہنما و رہبر کا بڑے دل نشیں انداز میں کیا ہے ۔ یہ رہنما ہیں ۔ مرشدِ رومی جو ''اسرارِ خودی'' سے لے کر ''جاوید نامہ'' اور ''ارمغانِ حجاز'' تک ہر جگہ چھائے ہوئے ہیں ۔ اس مثنوی میں حضرت علامہؒ نے وہ مشہور واقعہ نظم کیا ہے جس نے حلب کے ایک ظاہر بیں اور مغرور مولوی کو ''مولانے روم'' بنا دیا اور اس طرح ''حبر'' کو ''نظر'' اور ''عشق'' کو ''عقل'' پر برتری اور فوقیت عطا کر دی ۔ اس دل نشیں واقعہ کو حضرت علامہ کی زبانِ فیض ترجمان سے سنیے :

آگہی از قصہ آخوندِ روم
آن کہ داد اندر حلب درس علوم
پائے در زنجیرِ توجہاتِ عقل
کشتیش طوفانی ظلماتِ عقل

از تشکک گفت و از اشراق گفت
و ز حکم صد گوہرِ تابندہ سفت

گرد و پیشش بود انبارِ کتب
بر لبِ او شرحِ اسرارِ کتب

ٹھیک ہو چکا تھا ''[1]

حضرت علامہ ''دعا'' کے سختی سے قائل تھے یہاں تک کہ انہوں نے اپنے ایک خطبہ کا نام ہی ''ذات الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا'' رکھا اُن کا ایمان تھا کہ دعا میں اگر خلوص اور ایقان شامل ہو تو وہ کبھی خطا نہیں جاتی ۔ ایک دفعہ اُن کے چند احباب نے اُن سے ''دعا'' کی حقیقت کی وضاحت کے لیے عرض کیا تو انہوں نے فرمایا ۔

''دعا جزو ایمان ہے ، ہم اللہ کو مانتے ہیں تو دعا بھی کریں گے وہ جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے وہ ہم سے اور ہماری دنیا سے بے تعلق نہیں ، ہم جو کچھ کہتے ہیں اُسی سے کہتے ہیں ۔ وہ کہتا ہے مجھ ہی سے دعا کرو ۔ میں تمہاری دعا سنتا اور اس کا جواب دیتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ انسان کی ساری زندگی دعا ہے ۔ دعا جو اللہ تعالیٰ کو قادر مطلق ، رب اور خالق اور سمیع و علیم مان کر صمیم قلب سے نکلتی ہے ، دعا جو عبادت ہے ، ذکر ہے ، صلوات ہے ! دعا جو طلب بھی ہے ، تڑپ ، امید اور آرزو بھی ، جو محض تسکین قلب کا ذریعہ نہیں ہے ، نہ فریب نفس بلکہ ایک حقیقت ۔ اس نکتے کو دو شخص خوب سمجھے ۔ ابن خلدون اور ابن عربی''[2]

اب جب کہ ابن عربی کا نام آ گیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بارے میں حضرت علامہ کے خیالات و جذبات کی وضاحت کر دی جائے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک زمانہ میں وہ حکیم سنائی، منصور حلاج اور ابن عربی رحمتہ اللہ علیہم کے سخت مخالف تھے ۔ لیکن بعد میں جب انہوں نے ابن عربی کی ایمان افروز تصانیف اور تعلیمات کا عمیق نظروں سے مطالعہ کیا تو انہیں ایک عظیم حکیم اور صوفی سمجھنے لگے اور اُن کے دل میں ابن عربی کی محبت و عقیدت کے جذبات پیدا ہو گئے ۔ جس کا اظہار حضرت علامہ کی آخری تحریروں سے ہوتا ہے ۔ لفظ 'دہر' پر

۱۔ اقبال درون خانہ تالیف خالد نظیر صوفی لاہور ۱۹۷۱ء ص ۱۷۷ تا ۱۸۱ ۔

۲۔ اقبال کے حضور تالیف سید نذیر نیازی کراچی ۱۹۷۱ء ص ۳۶۰ تا ۳۶۲ ۔

بحث کرتے ہوئے حضرت علامہ لکھتے ہیں ۔

''حکمائے اسلام اور حضرات صوفیہ کو زمانے کے مسئلے سے بڑی دل چسپی تھی ۔ کچھ تو اس لیے کہ قرآن پاک نے اختلاف لیل و نہار کا شمار اہم ترین آیات الٰہیہ میں کیا ہے اور کچھ اس لیے کہ حضور رسالتمآبؐ نے ''دہر'' کو ذات الٰہیہ کا مترادف ٹھہرایا ۔ آپؐ کا یہ ارشاد جس مشہور حدیث میں نقل ہوا ۔ اُس کی طرف ہم پہلے سے اشارہ کر آئے ہیں ۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ بعض اکابر صوفیہ نے لفظ دہر سے طرح طرح کے صوفیانہ نکات پیدا کئے ۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ دہر اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے اور ایسے ہی راری نے بھی تفسیر قرآن میں لکھا ہے کہ بعض صوفی بزرگوں نے انہیں لفظ دہر ، دیہود یا دیہار کی تلقین کی تھی''[۱]

ایک اور جگہ پر ''مابعدالطبیعات'' پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں اسلامی اندلس کے مشہور صوفی ، فلسفی ابن عربی کا یہ قول کیا خوب ہے کہ وجود مدرک تو خدا ہے کائنات معنی''[۲]

مندرجہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عربی کے حکیمانہ اور صوفیانہ خیالات سے حضرت علامہ نے کافی فائدہ اٹھایا ہے اور ان سے استدلال بھی کیا ہے ۔ حضرت علامہ ابن عربی کے نظریۂ حقیقت زماں سے بہت متاثر تھے اور اس مسئلہ پر وہ یورپ میں ایک مقالہ بھی پڑھنا چاہتے تھے چنانچہ وہ اپنے دور کے ابن عربی کے سب سے بڑے ماہر حضرت پیر مہر علی شاہ دربار گولڑہ شریف (راولپنڈی) کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں ۔

''میں نے گذشتہ سال انگلستان میں حضرت مجدد الف ثانیؒ پر تقریر کی تھی جو وہاں کے ادا شناس لوگوں میں بہت مقبول ہوئی ، اب پھر اُدھر جانے کا قصد ہے اور اس سفر میں حضرت محی الدین ابن عربی پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے نظر بہ ایں حال چند امور دریافت طلب ہیں ۔

۱۔ خطبات اقبال ترجمہ سید نذیر نیازی لاہور ۱۹۵۸ء ص ۔ ۱۱۱
۲۔ ایضاً ص ۲۸۱ ۔

۱ - حضرت شیخ اکبر نے تعلیم حقیقت زماں کے متعلق کیا کہا ہے -
۲ - یہ تعلیم شیخ اکبر کی کون کون سی کتب میں پائی جاتی ہے -
۳ - حضرات صوفیہ میں سے اگر کسی اور بزرگ نے حقیقت زماں پر بحث کی ہو تو اُن بزرگ کے ارشادات بھی مطلوب ہیں''[1]

حضرت علامہ کا یہ خط ۱۸ - اگست ۱۹۳۳ء کا ہے اسی مسئلہ کے متعلق انہوں نے سید سلیمان ندوی کو بھی ، ۱۷ ستمبر ۱۹۳۳ء ، اور ۱۵ دسمبر ۱۹۳۳ء کو خطوط لکھے - سید نذیر نیازی مرحوم فرماتے ہیں کہ کسی نے حضرت علامہ کے حضور یہ موضوع چھیڑا کہ فطرت انسانی نے ستاروں سے بڑا اثر قبول کیا ہے تو آپ نے فرمایا -

''ستارے ذی روح کتّرے ہیں - ستاروں کی حرکات نقص سے خالی ہیں - روحیں ستاروں میں قیام کرتی ہیں - یہ اور کتنی باتیں ہیں جن سے فلاسفہ اور ارباب مذہب کی تحریریں بھری پڑی ہیں - لیکن ان سب میں پر اثر اور معنی خیز بات یہ ہے کہ ستاروں نے بعض افراد کو اپنی طرف کھینچا ، انہیں اپنے یہاں آنے کی دعوت دی یا یوں کہیے کہ بعض انسانوں کا خیال اس طرف گیا کہ آسمان کا سفر کریں ، ستاروں میں پہنچیں اور ان میں گھوم پھر کر واپس آ جائیں - ابن عربی ہی کو دیکھیے - اُن کی شخصیت کیسی عظیم ہے - وہ ستاروں میں اپنی سیاحتوں کا حال بیان کرتے نہیں تھکتے - ایک کے بعد دوسرے ستاروں کا رخ کرتے ہیں ، سیاروں میں جاتے ہیں اور وہاں انہیں جو مشاہدات ہوتے ہیں اُن کے بیان میں کیا کچھ نہیں کہتے - ابن عربی عجیب و غریب انسان تھے ، لیکن اس سے بھی عجیب تر انسان کا یہ جذبہ ہے کہ روح انسانی زمین سے رستگاری حاصل کرے ، عالم بالا کی سیر کرتی پھرے ، زمین سے آزاد ہو جائے اور انسان کو زمین سے آزاد ہونا چاہیے''[2]

۱- انتخاب روح مکاتیب اقبال مرتب عبداللہ قریشی لاہور ۱۹۷۷ء ص ۴۶۸ -

۲- اقبال کے حضور مرتب سید نذیر نیازی کراچی ۱۹۷۱ء ص ۳۰۲ - ۳۰۳ -

حضرت ابن عربی کے معراج نامہ ''فتوحات مکیہ'' سے علامہ اقبال بہت زیادہ متاثر ہیں اور اسی کے تتبع میں انہوں نے جاوید نامہ تحریر کیا ہے جس میں اُن کے رہبر و رہنما مرشد رومیؒ ہیں جو ابن عربی کے معنوی شاگرد ہیں اور فلسفہ وحدت الوجود کے فکری انداز عطا کرنے میں نمایاں مقام کے مالک ہیں ۔ جناب صبیح احمد کمالی نے اپنے مفصّل مقالہ ''جاوید نامہ اور اُس کے پیشرو'' میں جاوید نامہ اور اس سے پہلے اس موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں ''الغفران'' تالیف ابوالعلا معری ، ''فتوحات مکیہ'' تالیف شیخ محی الدین ابن عربی اور ڈیوائن کامیڈی'' تالیف ڈانٹے کا جامع انداز میں متعارف کروایا ہے اور جاوید نامہ اور ان کتابوں میں جو قدر مشترک ہے اُس کی نشاندھی بھی کی ہے ''جاوید نامہ اور فتوحات مکیہ'' کی سرخی کے تحت لکھتے ہیں ۔

''اقبال وحدت الوجود کے عقیدہ کا حامی نہ سہی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی طبیعت تصوف کی جانب ایک خاص رجحان اور مناسبت رکھتی تھی ، وہ عقلیت کا پرستار نہیں بلکہ اس سے غیر مطمئن ہے ۔ اس کے یہاں ہمیں وہ سب چیزیں ملتی ہیں جو افلاطونیت جدید سے اثر قبول کرنے والے تصوف کا طرۂ امتیاز ہیں ، عقل و دل کی کشمکش میں دل کی افضلیت عالم خاکی میں اجنبیت کا احساس ، اعتبارات حواس سے گزر کر فیضان عشق کے ذریعے سے حقیقت کے مشاہدے کی جستجو ، خواص طبعی کی مزاحمت سے نجات کی آرزو ، اور صور مجازی سے ہٹ کر حقائق اشیاء کے علم کی طلب ، یہ وہ چیزیں ہیں جن کی تصوف نے اشاعت کی اور اقبال کی شاعری میں ہمیں جا بجا ملتی ہیں ۔ اقبال کی اور شیخ اکبر کی تصنیفات کو اس پس منظر میں دیکھنے سے اندازہ ہو گا کہ اگر ان دونوں میں ایک قسم کا روحانی رشتہ نظر آتا ہے تو یہ کوئی تعجب کی چیز نہیں ۔ فتوحات مکیہ اور جاوید نامہ کے مشابہت کے دو نکتے ہمارے سامنے وضاحت کے ساتھ آتے ہیں ۔ اولاً : اقبال نے ابن عربی کی طرح اپنی سیاحت میں دوزخ کو علاحدہ شکل میں شامل نہیں کیا ہے ۔ وہ سیر افلاک کے دوران ہی میں ان لوگوں سے ملتا ہے جو جہنم کے مستحق تھے ۔ پھر آں سوئے افلاک میں پہنچ کر کاخ فردوس سے ہوتا ہوا مرحلہ ''حضور'' میں پہنچتا ہے ، ثانیاً مرحلۂ ذات اور حضور میں اُسے تقدیر کائنات کا محرم بنایا جاتا ہے جس

طرح فتوحات کا ''عالم'' صفات ذاتی و تکوینی کا مشاہدہ کرتا ہے''[1]

چوہدری محمد حسین مرحوم نے بھی اپنے مضمون میں جو جاوید نامہ سے متعلق ہے فتوحات مکیہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔ اُس کا ایک اقتباس بھی خالی از دل چسپی نہ ہو گا ۔

''معراج کا مذہبی اور علمی پہلو تو وہی ہے جسے مشاہدۂ تجلی ذات کہنا چاہئے جو پیغمبر خداؐ کو نصیب ہوا ۔ دوسرا پہلو وہ ہے جسے تصوف کا پہلو کہنا چاہیے ۔ صوفیا کا معراج بھی در اصل ایک قسم کا علمی اور مذہبی پہلو رکھتا ہے ۔ مختلف صوفیا نے مختلف رنگوں میں تجلی ذات کے مشاہدے کا ذکر کیا ہے ۔ تصوف اُن طریقوں کا نام ہے جن سے براہ راست معرفت ذات باری کے حصول کی کوشش کی جاتی ہے اور جو لوگ ان طریقوں کے اختیار میں تجلی ذات کے پرتو سے بہرہ یاب ہوئے انہوں نے بعض اوقات اس حصول مقصد کو معراج سے تعبیر کیا ۔ اعاظم صوفیا میں بایزید بسطامی اور محی الدین ابن عربی کا معراج مشہور ہے ۔ حضرت بایزید بسطامی کے معراج کی کیفیات تو شاید قلم بند ہی نہ ہوئیں لیکن محی الدین ابن عربی نے ، فتوحات مکیہ ، میں اپنے معراج پر دفتر کے دفتر لکھے ہیں اور سیاحت علوی میں دو افراد کو اپنا رہنما اور ساتھی بنا کر جن میں ایک فلسفی ہے اور دوسرا عالم دین ، اُن کی زبان سے تمام دنیا جہان کے علوم و فنون اور مسائل و مباحث کے متعلق اس انداز سے اظہار خیالات فرمایا ہے کہ گویا یہ سب خیالات وہ الہامات ہیں جو اُن کے قلب پر معراج میں وارد ہوئے ، خالص عرفانی ہونے کی بجائے محی الدین ابن عربی کا معراج زیادہ تر مذہبی ہے ، سیاحت آسمان اور مشاہدۂ ذات کے حقائق بے حد تفصیلات سے دیئے ہیں ۔ منازل ، مناظر ، واقعات ، کیفیات ، مشاہدات کم و بیش ایسی ترتیب میں ہیں جس میں معراج پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ! تفصیلات و تشریحات نے تصویر کو اس کامل صورت میں پیش کیا ہے کہ ڈانٹے کے نقاد کو ''ڈیوائن کامیڈی'' کا تمام نقشہ ''فتوحات مکیہ'' کے انہیں ابواب کا چربہ نظر آتا ہے جن

۱۔ علی گڑھ میگزین ۱۹۴۶ء ص ۳۸ - ۳۹ -

میں معراج کا ذکر ہے ''۱

(۶)

یورپ سے واپسی کے فوراً بعد ہی حضرت علامہ نے ''مثنوی اسرارِ خودی'' لکھنی شروع کر دی ۔ جولائی ۱۹۱۱ء میں عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں :

''قبلہ والد نے فرمائش کی ہے کہ حضرت بو علی قلندر کی مثنوی کی طرز پر ایک مثنوی لکھوں ۔ اس راہ کی مشکلات کے باوجود میں نے کام شروع کر دیا ہے ۔''۲

مثنوی مکمل ہوئی تو اس کے کئی نام حضرت علامہ کے ذہن میں تھے مثلاً ''اسرارِ حیات'' ، ''پیامِ نو'' اور ''آئینِ نو'' وغیرہم ۔ لیکن آخر قرعۂ فال ''اسرارِ خودی'' پر پڑا ۔ مثنوی کے دیباچہ میں وحدت الوجود اور متن میں خواجہ حافظ شیرازی کی لازوال اور مسحور کن شاعری کے اُن مہلک اثرات کا ذکر کیا گیا جو ہر دور کے سطحی مطالعہ سے پیدا ہوتے ہیں ۔ اس مثنوی کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف سے حضرت علامہ پر دشمن تصوف اور دشمن حافظ کے الزامات عائد ہونا شروع ہو گئے اور حضرت علامہ کے موافقین اور مخالفین میں قلمی جنگ شروع ہو گئی اور لطف یہ ہے کہ حضرت علامہ سے مخالفین میں زیادہ تعداد اُن دوستوں کی تھی مثلاً خواجہ حسن نظامی ، مولانا غلام بھیک نیرنگ اور یہاں تک کہ خود اُن کے والدِ محترم بھی اس صف میں شامل تھے ۔

اس مخالفت کے دور میں اُن لوگوں کی بن آئی جو واقعتاً تصوف کے مخالف تھے اور انہوں نے نفسِ تصوف کے خلاف مقالات و مضامین شائع کرنا شروع کر دیے ۔ حالاں کہ حضرت علامہؒ تصوف کے مخالف نہیں تھے ۔ بلکہ وہ تو خود بھی سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے حضرت علامہؒ

۱- شرح جاوید نامہ مرتبہ صبغت اللہ بخاری لاہور مضمون چوہدری محمد حسین ، ص ۷۴ - ۷۵ ۔

۲- ''اقبال نامہ'' ، حصہ دوم ، مرتب شیخ عطاء اللہ ، لاہور ۱۹۵۱ء ، ص ۱۳۸ - ۱۳۹

کے خلاف لکھے گئے مضامین اور تحریروں کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ انہوں نے ایک دانا منصف و حکیم کی طرح جو بات انہیں صحیح نظر آئی اُسے انہوں نے صدقِ دل سے قبول کر لیا۔

''اسرارِ خودی'' کی دوسری اشاعت کے وقت جب انہوں نے خواجہ حافظ کے خلاف لکھے گئے اشعار کو حذف کر دیا تو ان کے دوست مولانا اسلم جیراج پوری نے اس کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا:

"عرفی کے اشارے سے محض اس کے بعض اشعار کی تلمیح مقصود تھی۔ مثلاً

گرفتم آنکہ بہشتم دہند بے طاعت
قبول کردن صدقہ نہ شرطِ انصاف است

لیکن اس مقابلے سے میں خود مطمئن نہ تھا اور یہ ایک مزید وجہ ان اشعار کو حذف کر دینے کی تھی۔''[1]

مندرجہ بالا مختصر سا اقتباس معلوم ہوتا ہے کہ ''اسرارِ خودی'' کے دوسرے ایڈیشن میں خواجہ حافظ کے بارے میں لکھے گئے اشعار کے اخراج کی وجہ محض ''غوغائے عوام'' نہ تھی بلکہ خود بھی حضرت علامہ سمجھتے تھے کہ حافظ کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ باقی رہی وحدت الوجود اور شیخ اکبر کی مخالفت تو انہوں نے شیخ کی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے خیر آباد سکول کے ایک ہونہار طالب علم مولانا عبداللہ عادیؒ[2] کی طرف رجوع کیا اور اس طرح حضرت شیخ کے بارے میں اُن کے خیالات میں جو تبدیلی ہوئی اُس کا ذکر ہم تفصیل سے کر چکے ہیں۔

''اسرارِ خودی'' اخلاق و تصوف اور اسلامی تعلیمات کا ایک بہترین مرقع ہے۔ کتاب میں جابجا اولیاء کرام اور ان کی تعلیمات و ارشادات کا ذکر ہے۔ حضرت داتا صاحب، حضرت میاں میر اور حضرت بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہم کا ذکر بڑی عقیدت و محبت سے کیا گیا ہے۔ داتا صاحبؒ

۱- رختِ سفر مرتبہ انور حارث، کراچی، بار دوم، ۱۹۷۷ء ص ۱۷۹۔

۲- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: نقوش شخصیات نمبر، حصہ دوم، مضمون ابو الخیر مودودی، ص ۸۲۰۔

سے حضرت علامہ کی عقیدت کا ذکر تو ہم پہلے کر چکے ہیں ۔ حضرت بوعلی قلندرؒ کے ایک قلندرانہ واقعہ کا ذکر حضرت علامہ نے بڑے والہانہ انداز میں قلم بند کیا ہے ۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاحبِ جلال درویش کتنی روحانی طاقت کا مالک ہوتا ہے وہ فردِ کامل بھی ہوتا ہے اور بحر و بر کا مالک بھی اس موقعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

یا تو می گویم حدیثِ بوعلی — در سوادِ ہند نامِ او جلی
آں نوا پیرائے گلزارِ کہن — گفت با ما از گلِ رعنا سخن
خطہ ایں جنت آتش نژاد — از ہوائے دامنش مینو سواد
کوچک ابدالش سوئے بازار رفت — از شرابِ بو علی سرشار رفت
عامل آں شہر می آمد سوار — ہم رکابِ او غلام و چوبدار
پیش رو زد بانگ اے ناہوش‌مند — بر جلو دارانِ عامل رہ مبند
رفت آں درویشِ سرافگندہ پیش — غوطہ زن اندریمِ افکارِ خویش
چوبدار از جامِ اشک بار مست — برسرِ درویش چوبِ خود شکست
از رہِ عامل فقیر آزردہ رفت — دل گران و ناخوش و افسردہ رفت
در حضورِ بوعلی فریاد کرد — اشک از زندانِ چشم آزاد کرد
صورت برقے کہ برکہسار ریخت — شیخؒ سیل آتش گفتار ریخت
از رگِ جاں آتشِ دیگر کشود — با دبیرِ خویش ارشادے نمود
خامہ را برگیر و فرمانے نویس — از فقیر سوئے سلطانے نویس
بندہ ام را عاملت برسرزدہ است — بر متاعِ جانِ خود اخگر زدہ‌است
باز گیر ایں عامل بد گوہرے — ورنہ بخشم ملکِ تو با دیگرے
نامۂ آن بندۂ حق دست گاہ — لرزہ ہا انداخت در اندام شاہ
پیکرش سرمایۂ آلام گشت — زرد مثلِ آفتابِ شامِ گشت
بہر عامل حلقۂ زنجیر جست — از قلندر عفوِ ایں تقصیر جست[1]

حضرت علامہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں خواجہ الطاف حسین حالی کی صد سالہ برسی کے موقع پر پانی پت تشریف لے گئے تو حضرت بوعلی قلندر کی درگاہِ عالیہ پر بھی حاضر ہوئے ۔ سید نذیر نیازی لکھتے ہیں :

۱۔ کلیات اقبال حصہ فارسی ، اسرار و رموز ، ۲۵ تا ۲۷ ۔

''پانی پت میں حضرت علامہ کا قیام دو روز رہا ، انہوں نے تقریب میں شرکت فرمائی ۔ حضرت شاہ بوعلی قلندر کے مزار پر عقیدت مندانہ حاضری دی ۔'' مکتوباتِ اقبال بنام سید نذیر نیازی ، کراچی ، ۱۹۵۷ء ، ص ۳۰۱ ۔

اس مثنوی کا خاص موضوع فلسفۂ خودی ہے اور فلسفہ بھی بنیادی طور پر اولیاء کرام کی تعلیمات ہی سے ماخوذ ہے اور حضرت علامہؒ تو خاص طور پر حضرت بوعلی قلندر کے درج ذیل اشعار سے متاثر ہیں :

خود شناسی در جہان عرفان بود
عارفِ خود عارفِ سبحان بود
کشف دانی چیست ؟ عالی ہمتی
مرد رہ نبود بہ جز زورِ خودی
صوفیاں چوں عارفِ خویش ؟ آمدند[1]
در خودیٔ خویشتن ؟ پیش آمدند

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ سلسلۂ قادریہ کے ایک عظیم بزرگ تھے ، شاہ جہانگیر ، شاہ جہان ، اورنگ زیب عالمگیر اور دارا شکوہ وغیرہم آپ کے دربار پر انوار میں کسبِ فیض کے لیے حاضر ہوتے رہے ۔ آپ کا مزار مبارک کئی سو سال سے لاہور میں مرجع خاص و عام ہے ۔ حضرت علامہ آپ کے مزار پر انوار پر اکثر حاضر ہوتے ۔ مثنوی ''اسرارِ خودی'' میں آپ کا ذکر حضرت علامہ نے بڑی محبت ، عقیدت اور خلوص سے کیا ہے ۔ چند اشعار یہ ہیں :

حضرت شیخ میاں میر ولیؒ — ہر خفی از نور جان اوجلی
بر طریقِ مصطفٰی محکم بپے — نغمۂ عشق و محبت رائئے
تربتش ایمان خاکِ شہرِ ما — مشعلِ نورِ ہدایت بہرِ ما[2]

مندرجہ بالا مصرع : تربتش ایمان خاکِ شہرِ ما کے ساتھ ساتھ

۱۔ اقبال درونِ خانہ تالیف خالد نظیر صوفی ، لاہور ۱۹۷۱ء ، ص ۸۸ - ۸۹ ۔

۲۔ کلیات اقبال حصہ فارسی اسرار و رموز ص ۶۳ ۔

میں ان دنوں میوہسپتال میں ہاؤس سرجن تھا اور میرا یہ بچہ میوہسپتال کے ملحقہ کوارٹر میں پیدا ہوا ۔ بچے کی پیدائش صبح دو اور تین بجے کے درمیان ہوئی ۔ چنانچہ جب بچہ پیدا ہو گیا تو میں اُس لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ جس نے ڈیلوری کرائی تھی ، سائیکل اٹھا کر گھر سے باہر نکل آیا اور سیدھا میو روڈ پر واقع شاعر مشرق کی قیام گاہ جاوید منزل پہنچا ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی میں نے ڈرائنگ روم اور آپ کے کمرۂ خاص کے درمیانی دروازے میں قدم رکھا ہی تھا اور ابھی میں سلام بھی نہیں کہنے پایا تھا کہ حضرت علامہ جو بستر پر نیم دراز حقے سے شغل فرما رہے تھے بولے "مبارک ہو بچے کا نام مسیح الاسلام رکھنا ، اُسے ڈاکٹری کی تعلیم دلوانا اور سرکاری نوکری ہرگز نہ کروانا اور اُسے قرآن شریف ضرور حفظ کروانا" وہ تو اپنی دھن میں مجھے ہدایات دیتے رہے ، مگر میں وہیں کا وہیں حیران سا کھڑا اُن کا منہ دیکھتا رہا اور اُن کی عظیم شخصیت کا رعب مجھ پر اس قدر طاری ہوا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی نادیدہ طاقت میرا گلہ دبا رہی ہے ۔ علامہ مرحوم میری یہ حالت دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا : آؤ بھائی بیٹھو ڈرو نہیں ! ۔ ۔ ۔ ۔ چھ سات سال کی عمر میں میرا پہلا بچہ شدید بیمار ہو گیا ۔ اُن دنوں میں وزیر آباد کے ہسپتال میں متعین تھا جب دعا اور دوا دونوں بے اثر ثابت ہو گئیں اور بچے کی زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی تو میری بیوی کہنے لگی کہ یہ بچہ ہمیں حضرت علامہ کی دعا سے ملا تھا ۔ اس لیے اب بھی اُن ہی کے وسیلے سے اس کی جان بچ سکتی ہے ۔ چنانچہ میں اپنی بیوی کے مجبور کرنے پر اپنے بیمار بچے کو لے کر شاعر مشرق کی آخری آرامگاہ پر حاضر ہوا ۔ میری بیوی حضرت علامہ کے مرقد پر رو رو کر اس طرح التجائیں کرتی رہی جیسے اپنے سامنے موجود کسی شخص سے محو گفتگو ہو ، تھوڑی دیر بعد وہ بولی کہ حضرت علامہ نے کہا ہے کہ ہمارا بیٹا انشا اللہ تندرست ہو جائے گا ۔ اس کے بعد میری بیوی نے حکیم الامت کی قبر سے تھوڑی سی مٹی لی اور پانی میں گھول کر بچے کو پلا دی ، ہم نے تھوڑی سی مٹی ساتھ لی اور واپس وزیر آباد روانہ ہوگئے ، راستے میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے میری بیوی پانی میں گھول گھول کر بچے کو خاک مرقد دیتی رہی اور خدا کے فضل سے وزیر آباد پہنچنے تک ہمارا بچہ کافی حد تک

پیرِ تبریزی ز ارشادِ کمال
جستِ راہِ مکتبِ ملا جلال
گفت ایں غوغا و قیل و قال چیست
ایں قیاس و وہم و استدلال چیست
مولوی فرمود نادان لب بند
بر مقالاتِ خرد مندان مخند

پائے خویش از مکتبِ بیروں گزار
قیل و قال است ایں ترا با وے چہ کار

قالِ ما از فہم تو بالا تر است
شیشۂ ادراک را روشن گر است

سوزِ شمس از گفتۂ ملا فزود
آتشے از جانِ تبریزی کشود
بر زمیں برقِ نگاہِ او افتاد
خاک از سوزِ دمِ او شعلہ زاد
آتشِ دل خرمنِ ادراک سوخت
دفترِ آں فلسفی را پاک سوخت
مولوی بیگانہ از اعجازِ عشق
نا شناسِ نغمہ ہائے سازِ عشق
گفت ایں آتش چساں افروختی
دفترِ اربابِ حکمت سوختی
گفت شیخ اے مسلمِ زنار دار
ذوق و حال است ایں، ترا با وے چہ کار
حالِ ما از فکرِ تو بالا تر است
شعلۂ ما کیمیائے احمر است
ساختی از برفِ حکمت ساز و برگ
از سحابِ فکرِ تو بارد تگرگ

آتشے افروز از خاشاکِ خویش
شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش
علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است
معنیٔ اسلام ترکِ آفل است
چوں زبندِ آفل ابراہیم[۴] رست
درمیانِ شعلہ با نیکو نشست[۱]

اس دل پذیر حکایت کو حضرت علامہ[۵] کے پیر بھائی (خواجہ تاش) چوہدری غلام غوث صمدانی[۵] (۱۹۷۲ء - م) نے بھی اپنی تصنیف ''مثنوی صمدانی'' میں بڑے دل آویز طریقے سے قلم بند کیا ہے جس میں مولانا روم[۵] کے سوالات اور حضرت شمس تبریزی[۵] کے جوابات کو پورے سنتالیس صفحات پر پھیلا دیا ہے اور ان سوالات و جوابات میں شریعت اور طریقت کے جملہ اسرار و معارف کو پوری وضاحت سے بیان کر دیا ہے - جو حضرات تفصیل میں جانا چاہتے ہیں وہ ''مثنوی صمدانی'' مطبوعہ لاہور ۱۹۵۳ء کے صفحات ۱۸۹ تا ۲۳۶ کا مطالعہ کریں - سردست اس دل نشین حکایت کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں :

رومی :

گفت حیران ماندہ ام از ہستیت تو کدامی؟ وز کجا ابن مستیت
اے دل من می ربائی! کیستی؟ بندۂ! شانِ خدائی چیستی؟
اے کہ تو خوش پیکری مشکل کشا
از کرم سوئے خود را ہے نما

تبریزی :

گفت از تبریزم و شمش است نام
دینِ فطرت دینم و قرآن کلام
ہست در گشکولِ من جنسِ ثمیں
فلیؤد گفت قرآن مبین
جستجوئے ہم نوا دارم بسے
تا سپارم سوزِ دل با کسے

۱- کلیات اقبال حصہ فارسی اسرار و رموز ص ۶۷ - ۶۸

رومی :

اے بہ ہوش من نگاہت برق بار
رفتہ از دستم عنانِ اختیار
شد قدوم تو ، معما بہرِ من
تو کجا ، آخر کجا این شہرِ من
این جمال تو برد از رہ مرا
کن ز علمِ خویشتن آگہ مرا

تبریزی :

علمِ محسوسات رو بد از دماغ
علم مرئیات را باید چراغ
شورِ قیل و قال اندر مدرسہ
منطق و بحث و جدال و فلسفہ
علم حسی خود نگر خود پرور است
خود نما ، خود سر ، حجابِ اکبر است
بس کہ باشد پردۂ دل این حجاب
می برد از راہ چون موجِ سراب
خانقاہ و مکتب از جنسِ غرور
طالبانِ حق ز ہر باطل نفور
صد کتاب و صد ورق در نار کن
جان و دل را جانب دلدار کن
شب خراما ! نورِ روز از من بہ گیر
ساز داری ، لطفِ سوز از من بہ گیر
فاش تر گویم منم مامورِ عشق
تا بیاموزم ترا دستورِ عشق

رومی :

پارہ پارہ خواندہ ام ، ام الکتاب
من ندیدم لفظِ عشق اندر قصاب

تبریزی :

اے پرستارِ بتِ پندارِ علم
زیبِ بخشِ جبہ و دستارِ علم
عشق لفظے نیست بل حال است این
ہاں بہ خواں قرآن بہ چشمِ ژوف بیں
تو فقط الفاظِ قرآں خواندہ
بر کنارِ بحرِ معنی ماندہ
عشق را خواہی اگر شرح و بیان
تو بہ چشم عاشقان قرآں بہ خوان
عشق را بے عشق فہمیدن محال
ہر مؤذن نیست ہم رازِ بلال(۱)

(۷)

حضرت علامہ اقبالؒ اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ جس زمانے سے اُن کا تعلق ہے ۔ اُس زمانے میں برصغیر پاک و ہند میں جگہ جگہ علم و فضل اور شریعت و طریقت کے آفتاب و ماہتاب روشن تھے اور اپنی اپنی ضیاء پاشیوں سے طالبانِ حق کو منور اور مستفید کر رہے تھے۔ اپنے دور کی علمی و روحانی فضا کے بارے میں حضرت علامہؒ ایک جگہ خود فرماتے ہیں :

''گزشتہ رات میرے ہاں بہت سے احباب کا مجمع تھا ، مسلمانانِ ہندوستان کی عام روحانیت کا ذکر تھا اور بہت سے احباب مسلمانوں کے موجودہ انحطاط سے متاثر ہو کر ان سے مایوسی کا اظہار کر رہے تھے ۔ اس سلسلے میں مَیں نے ریمارک کیا کہ جس قوم سے خواجہ سلیمان تونسویؒ شاہ فضل الرحمان گنج مراد آبادیؒ اور خواجہ فرید چاچڑاں شریف والے اب اس زمانے میں پیدا ہو سکتے ہیں ۔ اس کی روحانیت کا خزانہ ابھی ختم نہیں ہوا ۔''(۲)

۱- ''مثنوی صمدانی'' تالیف چوہدری غلام غوث ، لاہور ۱۹۵۳ء، ص ۱۹۴ - ۲۰۳ -

۲- ''اقبال نامہ''، حصہ دوم ، مرتب شیخ عطاءاللہ لاہور ۱۹۵۱ء ، ص ۲۷۷ -

اس باب میں ہم حضرت علامہؒ کے معاصر مشائخ عظام اور اُن کے ساتھ حضرت علامہ کے مراسم و تعلقات کا ذکر کریں گے۔ علامہؒ کے معاصر مشائخ میں سے وہ حضرات لیے گئے ہیں جو ۱۹۰۰ء میں یا اس کے بعد فوت ہوئے جب کہ حضرت علامہ کی عمر ۲۶، ۲۷ سال کی ہو چکی تھی یا وہ حضرات جو اُن کی وفات تک کافی مشہور ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے ہم عصر مشائخ عظام کے اسماء گرامی ملاحظہ ہوں۔ اس کے بعد اُن سے حضرت علامہ کے تعلقات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ حضرت خواجہ اللہ بخش، تونسہ شریف (م ۱۹۰۱ء)
۲۔ حضرت خواجہ غلام فرید، چاچڑاں شریف (م ۱۹۰۱ء)
۳۔ حضرت مولانا غلام مرتضیٰ، بیریل شریف (م ۱۹۰۳ء)
۴۔ حضرت شاہ محمد حسین الہ آبادی، الہ آباد (م ۱۹۰۴ء)
۵۔ حضرت حاجی وارث علی شاہ، دیوہ شریف (م ۱۹۰۵ء)
۶۔ حضرت میاں محمد، کھڑی شریف، (م ۱۹۰۶ء)
۷۔ حضرت میاں شیر محمد، پلی بھیت بھارت (م ۱۹۰۶ء)
۸۔ حضرت پیر حیدر شاہ، جلال پور شریف (م ۱۹۰۸ء)
۹۔ حضرت مولانا عبدالمقتدر، بدایوں شریف (م ۱۹۱۴ء)
۱۰۔ حضرت شاہ عبدالصمد فخری، دہلی (م ۱۹۱۴ء)
۱۱۔ حضرت میاں محمد شاہ، بسی شریف (م ۱۹۱۴ء)
۱۲۔ حضرت شاہ عبدالعلیم آسی، جونپور (م ۱۹۱۷ء)
۱۳۔ حضرت شاہ سراج الحق، دہلی (م ۱۹۱۸ء)
۱۴۔ حضرت قاضی سلطان محمود، آوان شریف (م ۱۹۱۹ء)
۱۵۔ حضرت مولانا احمد رضا خان، بریلی شریف (م ۱۹۲۱ء)
۱۶۔ حضرت شاہ ابوالخیر، دہلی (م ۱۹۲۳ء)
۱۷۔ حضرت خواجہ عبدالرحمان، چھرہر شریف (م ۱۹۲۳ء)
۱۸۔ حضرت سید غلام محی الدین لیازی، بریلی شریف (م ۱۹۲۳ء)

۱۹- حضرت شاہ گل حسن قادری ، پانی پت (م لاسعلوم)
۲۰- حضرت شاہ بدرالدین ، پھلواری شریف بھارت (م۱۹۲۴ء)
۲۱- حضرت مولانا عبدالباری ، فرنگی محل لکھنؤ (م ۱۹۲۴ء)
۲۲- حضرت میاں شیر محمد ، شرق پور (م ۱۹۲۸ء)
۲۳- حضرت خواجہ ضیاء الدین ، سیال شریف (م ۱۹۲۹ء)
۲۴- حضرت شاہ سلیمان ، پھلواری شریف (م ۱۹۳۵ء)
۲۵- حضرت شاہ علی حسین ، کچھوچھہ شریف ، بھارت (م ۱۹۳۶ء)
۲۶- حضرت پیر مہر علی شاہ ، گولڑہ شریف (م ۱۹۳۷ء)
۲۷- حضرت پیر جماعت علی شاہ ثانی ، علی پور شریف (م ۱۹۳۹ء)
۲۸- حضرت مولانا قطب الدین عبدالوالی ، فرنگی محل ، لکھنؤ (م۱۹۵۴ء)
۲۹- حضرت خواجہ حسن نظامی ، دہلی (م ۱۹۵۵ء)
۳۰- حافظ جماعت علی شاہ ، علی پور شریف (م ۱۹۵۱ء)
۳۱- حضرت پیر غلام مجدد سرہندی ، حیدرآباد سندھ (م ۱۹۵۷ء)
۳۲- حضرت مولانا الیاس برنی ، حیدرآباد دکن (م ۱۹۵۹ء)
۳۳- حضرت مولانا عبدالقدیر ، بدایوں شریف (م ۱۹۶۰ء)
۳۴- حضرت خواجہ نظام الدین ، تونسہ شریف (م ۱۹۶۵ء)
۳۵- حضرت پیر فضل شاہ ، جلال پور شریف (۱۹۶۶ء)
۳۶- حضرت میاں علی محمد ، بسی شریف بھارت (۱۹۷۵ء)
۳۷- حضرت صاحب زادہ محبوب عالم ، آوان شریف (م ۱۹۸۲ء)
۳۸- مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ ، جال دین والی (زندہ)
۳۹- حضرت مولانا تاج الدین ، ناگ پور (م ۱۹۲۵ء)

اب مشائخ عظام کے ساتھ حضرت علامہ کے تعلقات اور مشائخ کے بارے میں اُن کے تاثرات ملاحظہ ہوں :

''حضرت شاہ گل حسن قادری ''تذکرۂ غوثیہ'' کے مصنف ہونے کی حیثیت سے بقائے دوام اور شہرت عام کے دربار میں ممتاز ترین مسند پر فائز ہیں وہ اوائل عمر میں سوات بنیر کے مشہور صوفی حضرت اخوند عبدالغفور (م ۱۸۷۷ء) کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے۔[1] اس کے بعد حضرت شاہ غوث علی قلندر پانی پتی سے تجدید بیعت کی اور مدت دراز تک اُن کے شرف صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ مرشد کی وفات کے بعد اُن حالات و ملفوظات کو ''تذکرۂ غوثیہ'' کے نام سے مرتب کیا۔ تذکرہ کا شمار اردو کی مقبول ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ شاہ صاحب صرف صاحب طرز ادیب ہی نہیں تھے بلکہ ایک مرشد کامل بھی تھے اور لاکھوں افراد نے اُن کی روحانیت اور روشن ضمیری سے فیض اُٹھایا۔ حضرت علامہ بھی اس درویش باصفا کی زیارت اور ملاقات کے بڑے متمنی تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنے دوست مرزا جلال الدین سے سنا کہ شاہ صاحب امرتسر تشریف لائے ہوئے ہیں تو وہ مرزا جلال الدین اور نواب ذوالفقار علی خان اکٹھے امرتسر گئے اور شاہ صاحب کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضرت علامہ کی اس حاضری کا ذکر مرزا جلال الدین نے بڑی تفصیل سے اپنے ایک مضمون ''میرا اقبال'' میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انہیں (اقبال) کو جو وابستگی تھی۔ اسی کی وجہ سے انہیں اولیائے کرام سے بھی خاص عقیدت تھی اور وہ اُن کے مزارات پر اکثر حاضر ہوا کرتے۔ لاہور میں حضرت علی ہجویری اور شاہ محمد غوث کے مزارات پر اکثر جاتے اور اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار فرماتے۔ ایک مرتبہ پانی پت کے چند اشخاص نے مجھے اپنے مقدمہ میں وکیل کیا۔ یہ اصحاب حضرت خواجہ غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کے سجادہ نشین سید گل حسن شاہ مصنف ''تذکرۂ غوثیہ'' کے مرید تھے۔ اُس زمانے میں شاہ صاحب کی روحانیت کا بہت شہرہ تھا، میرے مؤکل جب لوٹنے لگے تو میں نے شاہ صاحب کو سلام بھیجا اور کہا کہ کبھی پانی پت کی طرف آنے کا موقع ملا تو ضرور حاضرِ خدمت ہوں گا۔

۱۔ ''تذکرۂ غوثیہ'' تالیف شاہ گل حسن قادری پانی پت ۱۹۵۳ء، ص ۳۶۰۔

دو تین ماہ بعد اچانک ایک دن انہی اصحاب میں سے ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے لو شاہ صاحب خود ہی تشریف لے آئے ہیں اور ان دنوں وہ امرتسر میں مقیم ہیں ، اگر تم اُن سے ملنا چاہو تو میرے ساتھ چلو میں نے شاہ صاحب کے جائے قیام کا پتہ دریافت کر کے انہیں تو رخصت کیا اور خود ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچا ۔ وہ بھی چلنے کو تیار ہو گئے ۔ اتنے میں سر ذوالفقار علی خان تشریف لے آئے اور ہم تینوں ٹرین پر سوار ہو کر امرتسر پہنچے ۔ راستے میں یہ طے پایا کہ شاہ صاحب پر سر اقبال اور سر ذوالفقار کی شخصیت کا اظہار نہ کیا جائے ۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ دیکھنا مطلوب تھا کہ آیا شاہ صاحب بھی اپنے کشف سے اُن کی شخصیت کو تاڑ لیتے ہیں یا نہیں ۔ ہم شاہ صاحب کے پاس پہنچے تو میرے مؤکلوں میں سے ایک نے میرا تعارف کرایا اور میں نے اپنے رفقاء کو شیخ صاحب اور خان صاحب کے مختصر ناموں کے ساتھ پیش کیا ۔ دوران گفتگو میں شاہ صاحب نے دریافت کیا کہ آپ میں سے کوئی صاحب شعر بھی کہتے ہیں ۔ یہ سوال اپنی تمام تر سادگی کے باوجود ہمارے لیے حد درجہ اہم تھا ۔ اس لیے نواب صاحب اور میں کنکھیوں سے اقبال کی طرف دیکھنے لگے ۔ نواب صاحب نے ٹال دینے کی نیت سے جواب دیا کہ ہم بھی اہل پنجاب کی ادبی روایات کے تھوڑے بہت حامل ضرور ہیں ۔ مگر شاہ صاحب اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے ۔ کہنے لگے جس طرح پھول کی خوشبو خود بخود انسان کے دماغ تک پہنچ جاتی ہے ۔ مجھے بھی یوں محسوس ہو رہا ہے ۔ گویا آپ میں سے کوئی صاحب شاعر ضرور ہیں ۔

اتنے میں اندر سے کسی کی آواز آئی ''ارے یہ کہیں ذوالفقار تو نہیں بول رہے نواب صاحب حیران ہو گئے کہ اُن کا راز کیسے کھل گیا ۔ معلوم ہوا راجہ — تعلقہ دار یو ۔ پی جو شاہ صاحب کے مرید تھے اور نواب صاحب کے دوست تھے ، اپنے علاج کے سلسلے میں اپنے پیر صاحب کے ہمراہ امرتسر آئے ہوئے تھے ، اندر لیٹے ہیں ، انہوں نے نواب صاحب کی آواز فوراً پہچان لی اور نواب صاحب کا راز طشت از بام کر دیا ، اب میرے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں نے پشیمانی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا نام شاہ صاحب کو بتایا ۔ ڈاکٹر صاحب کا نام سن کر مسکرانے لگے ۔ پھر بولے میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ میں سے یہی حضرت شاعر ہیں ۔ اس کے بعد دیر تک ڈاکٹر صاحب کی نظموں کے متعلق

شاہ صاحب اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے - ہم چلنے کی نیت سے اٹھنے لگے تو اقبال نے شاہ صاحب سے کہا کہ وہ عرصہ سے سنگِ گردہ کے مریض ہیں - اُن کے لیے دعا کریں کہ انہیں اس شکایت سے نجات ملے - شاہ صاحب کہنے لگے - بہت اچھا لیجیے میں آپ کے لیے دعا کرتا ہوں آپ بھی ہاتھ اٹھائیں - دعا کے بعد ہم نے اجازت لی اور لاہور کی ٹرین میں سوار ہو گئے - راستے میں ڈاکٹر صاحب پیشاب کی نیت سے غسل خانے میں تشریف لے گئے ، واپس آئے تو اُن کے چہرے پر حیرت و استعجاب کے آثار نظر آ رہے تھے - کہنے لگے : عجب اتفاق ہوا ہے - پیشاب کے دوران مجھے یوں محسوس ہوا گویا ایک چھوٹا سا سنگریزہ پیشاب کے ساتھ خارج ہو گیا ہے - مجھے اس کے گرنے تک کی آواز سنائی دی اور اس کے خارج ہوتے ہی طبیعت کی ساری گرانی جاتی رہی -''[1]

حضرت میاں محمد مصنف ''سیف الملوک'' ، حضرت خواجہ غلام فرید اور حضرت حاجی وارث علی شاہؒ اور حضرت علامہ کے درمیان قدرِ مشترک ''مسلکِ عشق'' تھا یہ سب حضرات نہ صرف اس مسلک کے ترجمان اور مبلغ تھے بلکہ اسے روحِ ایمان اور جانِ ایمان بھی سمجھتے تھے - حضرت علامہ فرماتے ہیں :

ز رسم و راہِ شریعت نکردہ ام تحقیق
جز ایں کہ منکرِ عشق است کافر و زندیق[2]

میاں محمد اس سے بھی دو چار قدم آگے جاتے ہیں :

جنہاں عشق خرید نہ کیتا اینویں آ بگتے
عشقے باہجھ محمد بخشا کیا آدم کیا کتے

(سیف الملوک)

حضرت خواجہ غلام فرید کا دیوان تو بلا ریب ''عشق کی انجیل'' ہے - ہر طرف عشق ہی عشق کار فرما ہے - ایک جگہ فرماتے ہیں :

۱- ملفوظاتِ اقبال مرتب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، لاہور ۱۹۷۷ ، ص ۹۸ - ۱۰۰ -

۲- زبورِ عجم ص ۱۶۰ -

وِل عشق مچائی اگ سائیں ڈکھ سوز رچیا رگ رگ سائیں
(دیوانِ فرید)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے :

عشق ہے ہادی ہرم نگر دا عشق ہے رہبر فقر دا
عشقوں حاصل ہے عرفان (دیوانِ فرید)

حضرت خواجہ فرید اور اُن کی لافانی شاعری کے بارے میں حضرت علامہ فرماتے ہیں :

''جس قوم میں فرید اور اُس کی شاعری موجود ہے اُس قوم میں عشق و محبت کا موجود نہ ہونا تعجب انگیز ہے۔''[۱]

حضرت حاجی وارث علی شاہ اپنے متوسلین اور متعلقین کو ہمیشہ یہی ہدایت فرماتے :

(الف) ''ہمارا مشرب عشق ہے۔

(ب) عاشق وہ ہے جس کی کوئی سانس یادِ مطلوب سے خالی نہ ہو جائے۔

(ج) عاشق کے عشقِ صادق کی علامت یہ ہے کہ ذکرِ یار کی کثرت ہو۔

(د) جس کا عشق کامل ہوتا ہے اُس کا شوق فراق و وصال میں یکساں رہتا ہے۔

(ہ) عاشق کا ایمان رضائے یار ہے۔''[۲]

قطب العارفین حضرت قاضی سلطان محمودؒ دربار آوان شریف ضلع گجرات سے تو حضرت علامہ سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے (جس کا تفصیلی ذکر ہم مقالہ کی ابتدا میں کر چکے ہیں) اور اپنی زندگی وہ کئی مرتبہ

۱- دیوانِ فرید مرتب مولوی عزیز الرحمان بہاول پور ۱۹۴۴ء، مقدمہ از طالوت، ص ۴۷۔

۲- ''سعی الحارث فی ایمان الوارث''، تالیف ابراہیم شیدا، دہلی ۱۹۳۹ء، ص ۲۰۲، ۲۰۳۔

ضرور حصولِ فیض و برکات کے لیے مرشد کے حضور تشریف لے گئے ہوں گے لیکن اس سلسلہ میں ہمارے پاس سرِ دست معلومات نہیں ہیں۔

ہاں حضرت قاضی کی وفات کے بعد انہیں تجدیدِ بیعت کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کے لیے انہوں نے ناگپور بھارت کے ایک مجذوب بزرگ بابا تاج الدین اولیاء کی ذاتِ اقدس کا انتخاب بھی کر لیا۔ بابا صاحب کا حلقۂ ارادت بہت وسیع تھا۔ مولانا عبدالکریم المعروف بابا یوسف شاہ تاجی اور ایم۔ ایم احمد، سابق صدر شعبۂ فلسفہ کراچی یونیورسٹی جیسے فاضل حضرات اُن کے حلقۂ عقیدت میں شامل تھے۔ اپنے دوست راجہ کشن پرشاد کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

''نوازش نامہ مع سفر نامہ ناگپور ملا۔ میں نے اس چھوٹی سی کتاب کو بڑی مسرت سے پڑھا اور سرکار کی عقیدت سے دل کو ایک قسم کی روحانی ہالیدگی حاصل ہوئی۔ میرا قصد بھی اُن (مولانا تاج الدین ناگپوری) کی خدمت میں حاضر ہونے کا ہے۔ بعض وجوہ سے تجدیدِ بیعت کی ضرورت پیش آئی، سنتا ہوں کہ وہ مجذوب ہیں مگر آج کل زمانہ بھی مجاذیب کا ہے آج خواجہ حسن نظامی کو بھی خط لکھا ہے۔ اگر وہ بھی ہم سفر ہو گئے تو مزید لطف رہے۔''[1]

یہ بھی عجیب بات ہے کہ یورپ سے واپسی کے بعد حضرت علامہ کو مجذوبوں سے خاصی عقیدت ہو گئی تھی۔ ۱۹۱۷ء میں لاہور کی ایک مجذوبہ کا بہت چرچا تھا۔ مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں:

''آج کل لاہور میں سلطان کی سرائے میں ایک مجذوبہ نے بہت لوگوں کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ کسی روز اُن کی خدمت میں بھی جانے کا قصد ہے۔ شاد کا پیغام بھی پہنچا دوں گا۔''[2]

حضرت پیر حیدر شاہ جلال پوری عہدِ حاضر کے ممتاز ترین مشائخ میں سے تھے۔ وہ سلسلہ چشتیہ میں حضرت خواجہ شمس الدین سے بیعت

۱۔ روحِ مکاتیب اقبال، مرتب محمد عبداللہ قریشی لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۲۷۰۔

۲۔ اقبال نامہ، حصہ دوم مرتب شیخ عطاء اللہ، لاہور ۱۹۵۱ء، ص ۱۸۲۔

تھے - ۱۹۲۳ء میں اُن کے سلسلہ کے ایک نامور ادیب ملک محمد الدین مرحوم سابق ایڈیٹر 'صوفی' پنڈی بہاؤالدین ضلع گجرات نے اُن کی مفصل سوانح عمری شائع کی - اس سوانح عمری کے صفحہ ۱۱۰ کے سامنے علامہ اقبالؒ کے اُس قطعہ کا عکس درج ہے جس میں حضرت علامہ نے شاہ صاحب کے سنِ وفات کو نظم کیا ہے - قطعہ اس طرح ہے :

ہر کہ بر خاکِ مزارِ پیر حیدر شاہ رفت
تربتِ او را امین جلوہ ہائے طور گفت
ہاتف از گردوں رسید و خاکِ او را بوسہ داد
گفتش سالِ وفات او بگو "مغفور" گفت[1]

چونکہ شاہ صاحب جلال پوری سے حضرت علامہ کے کسی قسم کے عقیدت مندانہ تعلقات کا پتہ نہیں چلتا - اس لیے ڈاکٹر عبدالغنی فرماتے ہیں :

"ہمیں معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ انہوں (علامہ اقبال) نے یہ منفرد قسم کا قطعۂ تاریخ کیسے لکھا اور کب لکھا -"[2]

بات صرف اتنی ہے کہ ملک محمد الدین نے جب شاہ صاحب کے "سوانح" کا ڈول ڈالا تو انہوں نے اپنے تعلقات کی بنا پر مشاہیر شعراء سے شاہ صاحب کی وفات کے بارے میں سینکڑوں قطعات لکھوائے اور اُن میں سے چیدہ چیدہ کو حضرت کی سوانح عمری "ذکرِ حبیب" میں درج کیا - مثال کے طور پر منشی محمد دین فوق مرحوم کا لکھا ہوا قطعۂ تاریخ جو ذکرِ حبیب کے صفحہ ۱۱۷ پر درج ہے ، وہ فوق صاحب کے مجموعہ کلام "کلامِ فوق" کے صفحہ ۱۷۵ پر چھپا ہوا ہے - شروع میں فوق صاحب نے اس قطعہ کی شانِ نزول اس طرح بیان کی ہے :

"۱۳۲۶ھ میں حضرت پیر سید حیدر شاہ جلال پوری کا وصال ہوا - فروری ۱۹۱۶ء میں ملک محمد الدین ایڈیٹر 'صوفی' پنڈی بہاؤ الدین نے جو حضرت مغفور کے مریدوں میں سے ہیں ، لکھا کہ میں حضرت مرحوم کے سوانح حیات لکھ رہا ہوں - اُن کی وفات کا قطعۂ تاریخ لکھ دو - اُن کی

۱- ذکرِ حبیب مرتبہ ملک محمد الدین ۱۹۲۳ء ، ص ۱۱۱ -
۲- مجمع البحرین مرتب ڈاکٹر عبدالغنی ، ص ۳۰ -

فرمائش سے میں نے حسب ذیل قطعۂ تاریخ لکھا جو اپریل ۱۹۱۶ء کے 'صوفی' میں چھپ چکا ہے :

اے پیر سید حیدر اے ذوالفقار حیدر
مجموعۂ کرامت تھی تیری زندگی بھی
تو تھا فروغِ دل ہا تو تھا قرارِ جاں ہا
تو چل بسا تو رخصت اپنی ہوئی خوشی بھی
فیضِ کرم سے جس کے تھے تلخ کام شیریں
مغفور آج ہے وہ شیریں سخن ولی بھی[1]

۱۳۲۶ھ ۱۳۲۶ھ

''ذکرِ حبیب'' کے دیباچہ میں ملک محمد الدین خود بھی تحریر کرتے ہیں :

''میں ملک کے نامور شعراء کا بھی رہینِ منت ہوں جنہوں نے اپنے کلامِ بلاغت نظام سے مجھ کو ممتاز فرمایا ۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم ۔ اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی اور خان بہادر سید اکبر حسین الہ آبادی سے لے کر عام نغز گویان تک کے نتائج افکار کتاب کے اوراق میں درج ہیں ۔''[2]

اوپر کے ہر دو اقتباسات سے صاف طور پر ظاہر ہو رہا ہے کہ شاہ صاحب کی سوانح عمری ''ذکرِ حبیب'' میں شامل بیشتر قطعات تاریخ ملک محمد الدین کا حق دوستی ادا کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں نہ کہ حضرت جلال پوری کی عقیدت کی بنا پر ۔ ہاں حضرت علامہ کے قطعہ کے حرف حرف سے وہ عقیدت و احترام جھلک رہا ہے جو انہیں اولیائے کرام سے تھا ۔

حضرت شاہ سلیمان پھلواروی عہد اقبال کے بلند پایہ عالمِ دین اور صوفی تھے ۔ ''اسرارِ خودی'' کی اشاعت کے بعد ۱۹۱۶ء میں جب ناخوشگوار بحث چھڑ گئی تو حضرت علامہ نے شاہ سلیمان سے بھی رجوع کیا اور انہیں لکھا :

۱۔ ''کلامِ فوق'' تصنیف محمد دین فوق لاہور ۱۹۳۳ء ، ص ۱۷۵ ۔
۲۔ ''ذکرِ حبیب'' مرتبہ ملک محمد الدین دیباچہ ، ص ح ۔

''شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کوئی بد ظنی نہیں بلکہ مجھے اُن سے محبت ہے ۔ میرے والد کو فتوحات اور فصوص سے کمال توغل رہا ہے اور چار برس کی عمر سے میرے کانوں میں ان کا نام اور اُن کی تعلیم پڑنی شروع ہوئیں ۔ برسوں تک ان دونوں کتابوں کا درس ہمارے گھر میں رہا ، گو بچپن کے دنوں میں مجھے ان مسائل کی سمجھ نہ تھی تاہم محفلِ درس میں ہر روز شریک ہوتا ، بعد میں جب عربی سیکھی تو کچھ کچھ خود پڑھنے لگا اور جوں جوں علم اور تجربہ بڑھتا گیا ، میرا شوق اور واقفیت زیادہ ہوتی گئی ۔ اس وقت میرا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت شیخ کی تعلیمات قرآن کے مطابق نہیں ہیں اور نہ کسی تاویل و تشریح سے اس کے مطابق ہو سکتی ہیں ۔ لیکن یہ بالکل ممکن ہے کہ میں نے شیخ کا مفہوم غلط سمجھا ہو ، کئی سالوں تک میرا یہی خیال رہا ہے کہ میں غلطی پر ہوں ، گو اب میں سمجھتا ہوں کہ میں ایک قطعی نتیجے تک پہنچ گیا ہوں ۔ لیکن اس وقت بھی مجھے اپنے خیال کے لیے کوئی ضد نہیں ۔ اس واسطے بذریعہ عریضہ ہذا آپ کی خدمت میں ملتمس ہوں کہ از راہِ عنایت و مکرمت چند اشارات تطہیر فرما دیں ۔ میں ان اشارات کی روشنی میں فصوص اور فتوحات کو پھر دیکھوں گا اور اپنے علم و رائے میں مناسب ترمیم کر لوں گا ۔''[1]

حضرت پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی نہ صرف بلند مرتبت صوفی تھے بلکہ جید عالمِ دین بھی تھے ۔ منطق و فلسفہ پر مکمل عبور رکھتے تھے ، خصوصاً حضرت ابن عربی کے بارے میں تو وہ عالمِ اسلام میں سند کی حیثیت رکھتے تھے ۔

۱۹۳۳ء میں حضرت علامہ نے ارادہ کیا کہ یورپ میں جا کر وہ ابن عربی پر ایک لیکچر دیں ، ابنِ عربی کی تعلیمات اور فلسفہ کو سمجھنے کے لیے انہوں نے پیر صاحب سے رابطہ قائم کیا اور ایک مفصل خط اُن کی خدمت میں ارسال کیا جو حسب ذیل ہے :

۱۔ ''اقبال کے محبوب صوفیہ'' تالیف اعجاز الحق قدوسی ، لاہور ، ۱۹۸۲ء (بار دوم) ، ص ۵۱۷ ، ۵۱۸ ۔

"مخدوم و مکرم حضرت قبلہ ۔ السلام علیکم !

اگرچہ زیارت اور استفادہ کا شوق مدت سے ہے ، تاہم اس سے پہلے شرفِ نیاز حاصل نہیں ہوا ، اب اس محرومی کی تلافی اس عریضہ کے کرتا ہوں ، گو مجھے اندیشہ ہے کہ اس خط کا جواب لکھنے یا لکھوانے میں جناب کو زحمت ہوگی ۔ بہرحال جناب کی وسعتِ اخلاق پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ چند سطور لکھنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان بھر میں کوئی اور دروازہ نہیں جو پیشِ نظر مقصد کے لیے ٹھکرایا جائے ۔

میں نے گزشتہ سال انگلستان میں حضرت مجدد الف ثانی پر ایک تقریر کی تھی جو وہاں کے ادا شناس لوگوں میں بہت مقبول ہوئی ۔ اب پھر اُدھر جانے کا قصد ہے اور اس سفر میں حضرت محی الدین ابن عربی پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے ۔ نظر بایں حال چند امور دریافت طلب ہیں ۔ جناب کے اخلاقِ کریمانہ سے بعید نہ ہوگا اگر ان سوالات کا جواب شافی مرحمت فرمایا جائے :

(۱) اول یہ کہ حضرت شیخ اکبر نے تعلیم حقیقتِ زماں کے متعلق کہا ہے اور آئمہ متکلمین سے کہاں تک مختلف ہے ۔

(۲) یہ تعلیم شیخ اکبر کی کون کون سی کتب میں پائی جاتی ہے اور کہاں کہاں ، اس سوال کا مقصود یہ ہے کہ سوال اول کے جواب کی روشنی میں خود بھی ان مقامات کا مطالعہ کر سکوں ۔

(۳) حضراتِ صوفیہ میں سے اگر کسی بزرگ نے بھی حقیقت زماں پر بحث کی ہو تو اُن بزرگ کے ارشادات کے نشان بھی مطلوب ہیں ۔ مولوی سید انور شاہ مرحوم و مغفور نے عراق کا ایک رسالہ مرحمت فرمایا تھا اُس کا نام تھا "فی درایۃ الزمان" جناب کو ضرور اس کا علم ہوگا ۔ میں نے یہ رسالہ دیکھا ہے مگر چوں کہ یہ رسالہ بہت مختصر ہے اس واسطے مزید روشنی کی ضرورت ہے ۔

میں نے سنا ہے کہ جناب نے درس و تدریس کا سلسلہ ترک فرما دیا ہے ۔ اس واسطے مجھے یہ عریضہ لکھنے میں تامل تھا ، لیکن چوں کہ مقصود خدمت اسلام ہے مجھے یقین ہے کہ اس تصدیق کے لیے جناب مجھے

معاف فرمائیں گے اور جواب باصواب سے ممنون فرمائیں گے۔''[1]

شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ ۱۹۰۳ء میں اُن کے تعلقات حضرت علامہ سے قائم ہوئے جو اُن کی وفات تک قائم رہے۔ اپنے تعلقات کی ابتدا خواجہ صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ڈاکٹر سر محمد اقبال سے میرا ملنا جلنا ۱۹۰۳ء سے تھا۔ ایک دفعہ انجمن حمایت اسلام میں انہوں نے اپنی نظم خاص لحن سے پڑھی اور مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں نے اپنا عمامہ سر سے اتار کر اُن کو دے دیا اور کہا

تمہارے جام مے کی نذر میری پارسائی ہو

اراکین انجمن نے عمامہ نیلام کیا اور حکیم محمد اشرف آئی ڈاکٹر نے اُس کو خرید لیا۔''[2]

۱۹۰۸ء میں مشائخ عظام کو منظم اور متحد کرنے کے لیے خواجہ صاحب نے ایک تنظیم بنام ''حلقہ نظام المشائخ'' قائم کی اور خواجہ صاحب نے اس تنظیم میں شامل ہونے کے لیے مشائخ عظام کے علاوہ برصغیر کے علماء، فضلاء اور دردمند مسلمانوں سے بھی درخواست کی۔ چنانچہ خواجہ صاحب کی اپیل پر لبیک کہتے ہوئے تصوف سے دلچسپی رکھنے والے علم دوست حضرات کی کثیر تعداد نے اس تنظیم میں شرکت کی اور اس کے رکن بنے۔ چند اہم نام ملاحظہ ہوں:

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد، کلکتہ
(۲) نواب محمد مزمل خان، علی گڑھ
(۳) محمد اقبال بیرسٹر، لاہور
(۴) سید حسین شہید سہروردی، کلکتہ

۱۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ اول) مرتب شیخ عطاء اللہ، لاہور، ص ۴۴۲ تا ۴۴۴۔

۲۔ دیباچہ ''پاکستان کے موجد اول ڈاکٹر محمد اقبال کے خطوط'' مرتب حسن نظامی بحوالہ ''معاصرین اقبال کی نظر میں'' مرتب عبداللہ قریشی، ص ۴۰۴۔

(۵) مولانا محمد علی بی ۔ اے آکسن کوچہ لنگر خانہ ، رام پور

(۶) عبداللہ المامون سہروردی ، کلکتہ

(۷) حبیب الرحمان خاں سہروردی ، علی گڑھ

(۸) نواب سید امیر حسن ، کلکتہ

(۹) خجستہ اختر بانو سہروردیہ ، کلکتہ[۱] (والدہ حسین شہید سہروردی سابق وزیر اعظم پاکستان)

حلقۂ نظام المشائخ کی تشکیل اور اس کے اغراض و مقاصد کو خواجہ صاحب نے اپنی ایک تحریر میں اس طرح بیان کیا ہے ۔

"۱۹۰۸ء کا ذکر ہے میں نے ملا واحدی ، قاضی لطیف الدین پیر زادے درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور سید عطاءالدین پیرزادے درگاہ چراغ دہلی وغیرہ نے مل کر مشائخ صوفیہ کی خدمات کے لیے ایک جماعت قائم کی تھی ۔ اس کا نام حلقہ نظام المشائخ رکھا گیا تھا اور دہلی کے بازار چتلی قبر میں نواب غلام نصیرالدین عرف نواب بدھن کے عالی شان مکان میں اس کی منزل گاہ قائم ہوئی ۔ جہاں روزانہ دہلی کے نوجوان جمع ہو کر حلقے کے چار مقاصد پر تقریریں کرتے تھے ، وہ چار مقاصد یہ تھے :

(۱) علم تصوف کی حفاظت اور اشاعت ۔

(۲) مشائخ صوفیہ کا اتحاد ۔

(۳) عرسوں اور خانقاہوں کے اُن مراسم کی اصلاح جو شریعت اور طریقت کے خلاف ہوں ۔

(۴) مشائخ کے سیاسی حقوق کا تحفظ بذریعہ مسلم لیگ ۔

اسی سال میں نے حلقے کے مقاصد کی اشاعت کے لیے بنگال کا سفر کیا اور ڈھاکہ میں نواب سلیم اللہ مرحوم نے اس کام میں بہت مدد کی ، سہروردی خاندان کے اکثر افراد اس کے رکن بنے ، جون ۱۹۱۱ء میں میں نے حلقے کے مقاصد کی تبلیغ کے لیے حضرت مولانا سید امام الدین دیوان درگاہ اجمیر شریف کی تحریک سے ممالک اسلامیہ کا سفر

۱۔ ہفت روزہ منادی ، دہلی ۱۶ جون ۱۹۴۶ء ، ص ۶ ۔

گیا اور مصر ، فلسطین ، شام اور مدینہ منورہ کے مشائخ شاذلیہ ، رفاعیہ وغیرہ میں حلقے کی تبلیغ کی ، حضرت اکبر الہ آبادی اور حضرت مولانا محمد شاہ سلیمان پھلواروی کو اس حلقہ سے بہت دل چسپی اور ہمدردی تھی ۔''[۱]

''حلقہ نظام المشائخ'' کی تنظیم میں شامل ہونے کی خواجہ صاحب نے حضرت علامہ کو دعوت دی تو جواباً فرمایا :

''حلقہ نظام المشائخ کے متعلق آج مسٹر محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لاء سے سن کر بڑی خوشی ہوئی ۔ خدا کرے آپ کے کام میں ترقی ہو ، مجھے بھی اپنے حلقۂ مشائخ کے ادنیٰ ملازمین میں تصور کیجیے ۔ مجھے ذرا کاروبار کی طرف سے اطمینان ہو جائے تو پھر عملی طور پر اس میں دلچسپی لینے کو حاضر ہوں ، میری طرف سے مزار شریف پر بھی حاضر ہو کر عرض کیجیے ۔''[۲]

سب سے دل چسپ اور عجیب بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی قائم کردہ یہ تنظیم چند سالوں کی ناگزیر وجوہات کی بنا پر ختم ہو گئی لیکن حضرت علامہ کے دردمند دل میں ہمیشہ کے لیے یہ خیال مستقل طور پر جاں گزیں ہو گیا کہ مشائخ عظام کی ایک نمائندہ تنظیم قائم ہونی چاہیے ۱۹۳۰ء - ۱۹۳۱ء میں جب انھیں پیر زادگان دربار تونسہ شریف میں ایک جوہر قابل حضرت خواجہ نظام الدین کی شکل میں نظر آیا تو اُن کی دیرینہ خواہش جاگ اُٹھی اور انھوں نے خواجہ صاحب سے اُن کے ایک عقیدت مند مولوی محمد صالح کی معرفت رابطہ قائم کیا اور انہیں مشائخ کی تنظیم کی طرف متوجہ کیا ۔ چنانچہ مولوی صالح کو ۱۸ اپریل ۱۹۳۱ء میں تحریر کرتے ہیں :

''فی الحال یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قدیم سجادوں کے نوجوان مالک ایک جگہ جمع ہو کر مشورہ کریں کہ کس طرح اُس درخت کی حفاظت کی جا سکتی ہے جو اُن کے بزرگوں کی کوشش سے پھلا پھولا تھا ۔

۱۔ ''ماہنامہ نظام المشائخ'' کراچی ، مئی ۱۹۵۲ء ، ص ۱ - ۲ ۔
۲۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ دوم) مرتب شیخ عطاءاللہ ۱۹۵۱ء لاہور ص ۳۹۲ ۔

اب جو کچھ ہوگا نوجوان علماء و صوفیاء ہی سے ہوگا ۔ جن کے دلوں میں خدا نے احساسِ حفاظت ملی پیدا کر دیا ہے ۔ خواجہ صاحب (خواجہ نظام الدین) کی خدمت میں عرض کیجیے کہ وہ ایسے نوجوان سجادہ نشینوں کو ایک جگہ جمع کر لیں ۔ میں بھی وہاں حاضر ہو کر اُن کی مشورت میں مدد دوں گا ۔ یہ جلسہ فی الحال پرائیویٹ ہوگا ۔ میرے خیال میں ایسے نوجوانوں کی کافی تعداد ہے ۔ اُن کے نام دعوت جاری ہو اور اس پر اگر میرے دستخط کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں ۔''[۱]

۱۴ مئی ۱۹۳۱ء کے ایک خط میں مزید تحریر فرماتے ہیں :

''آپ مہربانی کرکے بواپسی ڈاک دو باتوں کا جواب دیں ۔

(۱) خواجہ صاحب اور دیگر نوجوان سجادہ نشین کون سی تاریخ کو وہاں (پاکپٹن شریف) موجود ہوں گے ۔

(۲) اگر میں پاک پٹن حاضر نہ ہو سکا تو کیا اور کوئی موقع ہو سکتا ہے کہ میں ان سب سے ایک مقام پر مل سکوں اور اپنی معروضات ان کی خدمت میں پیش کر سکوں ۔ ان باتوں کا جواب فوراً ارسال فرمائیے ۔''[۲]

خواجہ صاحب کی کوشش سے نوجوان صوفیائے کرام کا اجتماع پاک پتن میں ہوا ۔ لیکن حضرت علامہ بیماری کی وجہ سے اس اجتماع میں جو اُن ہی کی خواہش اور تحریک سے ہوا تھا ، شرکت نہ کر سکے جس کا انہیں ازحد افسوس ہوا ۔ مولوی محمد صالح کے نام ۷ جون ۱۹۳۱ء کے گرامی نامہ میں لکھتے ہیں :

''معلوم ہوتا ہے آپ اور حضرت خواجہ میرے تار اور خط کو فراموش کر گئے یا ممکن ہے تار کا مطلب صحیح نہ سمجھا گیا ہو اور خط نہ ملا ہو ۔ میں نے تار اور خط دونوں میں لکھ دیا تھا کہ میں دردِ دنداں میں مبتلا ہو گیا ہوں اور چار روز کی سخت تکلیف کے بعد دونوں دانت جو دکھتے تھے اُن کو اکھڑوا دیا گیا ۔ اگر یہ خط اور تار پہنچنے کے بعد بھی خواجہ صاحب نے بقول آپ کے میرے نہ آ سکنے کو برا محسوس کیا

۱۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ دوم) لاہور ۱۹۵۱ء ، ص ۳۸۴ ، ۳۸۵ ۔
۲۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ دوم) لاہور ۱۹۵۱ء ، ص ۳۸۹ ۔

تو مجھے تعجب بھی ہے اور افسوس بھی . . . باقی رہا مقصود جس کے لیے سفر کرنا تھا سو مجھے یہ لکھنے میں تامل نہیں کہ اس کا ایک پہلو سیاسی بھی ہے اور یہ اس وجہ سے کہ اسلام بحیثیت مذہب کے دین و سیاست کا جامع ہے ۔ میں نے جو حضرات مشائخ کو اس طرف متوجہ کرنے کا قصد کیا تھا وہ محض اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر تھا نہ اپنے نام و نمود کی خاطر ، خیال تھا کہ شاید اس طریق سے نوجوان صوفیہ میں کہ اُن کے اقتدار کا دار و مدار بھی اسلام کی زندگی پر ہے ۔ کچھ حرارت پیدا ہو جائے اور وہ کل نہیں تو جزاً اس کام میں شریک ہو جائیں ۔ خواجہ صاحب اگر اس تحریک میں شامل ہوں تو میرے عقیدے کی رو سے اُن کی سعادت ہے بلکہ میں چاہتا ہوں کہ اس ساری تحریک کا سہرا اُن ہی کے سر رہے ۔''[1]

اُسی دور میں حضرت علامہ کے جمال دین والی ذی علم سادات گھرانے کے ایک نوجوان مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ دام ظلہ سے تعلقات قائم ہوئے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت گہرے اور مستحکم ہوتے گئے ۔ مخدوم الملک جب لاہور آتے تو حضرت علامہ کے پاس ٹھہرتے ۔ ۱۹۳۷ء میں حضرت علامہ کے محب گرامی سر عبدالقادر لندن سے لاہور تشریف لائے تو حضرت علامہ نے انھیں کھانے کی دعوت دی ۔ اس دعوت میں مخدوم الملک بھی مدعو تھے ۔ اس دعوت کا ذکر سر عبدالقادر نے بڑے دل چسپ انداز میں کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

''دو اور دوست بھی موجود تھے جو کھانے میں شرکت کے لیے مدعو تھے ۔ ایک تو چوہدری محمد حسین ایم ۔ اے جو اُس زمانے میں اُن کے معتمد رفیق تھے اور اُن کی وفات کے بعد اُن کے صاحب زادے اور صاحب زادی کی نگرانی کے فرائض ادا کرتے رہے ، دوسرے صاحب ریاست بہاول پور کے ایک مشہور سادات خاندان کے رکن اور بڑے زمیندار اور بڑے رئیس تھے جن کا نام مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ ہے ۔ اُن سے میری ملاقات پہلے معمولی تھی ، مگر اُس دن یہ دیکھ کر کہ اقبال انہیں بہت پسند کرتے تھے اور وہ اقبال کے دلی مداح تھے ، میری اُن سے ملاقات

۱۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ دوم) لاہور ۱۹۵۱ء ، ص ۳۹۲ تا ۳۹۴ ۔

بڑھ گئی ، تھوڑی دیر میں کھانا آیا جس میں اقبال خود بھی شریک ہوئے اور کم از کم اُس وقت ایسی اچھی حالت میں تھے کہ کھانا بھی انہوں نے رغبت سے کھایا اور گفتگو بھی دوران طعام بہت دلچسپ ہوتی رہی ، طرح طرح کی باتیں ہوتی رہیں ، مخدوم الملک چوں کہ پیر زادے تھے اور اقبال مرحوم سے بہت عقیدت رکھتے تھے ۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ شیخ صاحب آپ کچھ بتا سکتے ہیں کہ اس زمانے کا قطب پنجاب میں کون ہے ۔ آپ ہی بتائیں ، انہوں نے کہا : میں تو سمجھتا ہوں کہ اقبال ہی قطب پنجاب ہیں ۔''[۱]

اپریل ۱۹۳۷ء میں مخدوم صاحب کی ملاقات حضرت علامہ سے ہوئی اور دسمبر ۱۹۳۷ء میں انہوں نے حج کی تیاریاں شروع کر دیں تو حضرت علامہ نے انہیں تحریر کیا :

''آپ کا خط آج صبح مل گیا ، الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں اور حج کی تیاریوں میں مصروف ۔ خدا تعالٰی آپ کو یہ سفر مبارک کرے اور اس کے فرشتوں کی رحمتیں آپ کے شریک حال ہوں ، کاش کہ میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا اور آپ کی صحبت کی برکت سے مستفیض ہوتا لیکن افسوس کہ جدائی کے ایام ابھی کچھ باقی معلوم ہوتے ہیں ۔ میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ و سلم کے روضۂ مبارک پر یاد بھی کیا جا سکوں ۔ تاہم حضور صلی اللہ علیہ و سلم کے اس ارشاد سے جرأت ہوتی ہے ۔ ''الطالح لی'' یعنی گنہگار میرے لیے ہے ، امید ہے کہ آپ اُس دربار میں پہنچ کر مجھے فراموش نہ فرمائیں گے ، باقی خدا تعالٰی کے فضل و کرم سے خیریت ہے ۔''[۲]

مخدم صاحب حج بیت اللہ سے واپس آئے تو حضرت علامہ نے انہیں مبارک باد کا خط لکھا :

''آپ کا تار گزشتہ رات کراچی سے ملا جس کو پڑھ کر بہت مسرت ہوئی ۔ میں آپ کی بہ خیریت واپسی پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور

۱۔ ماہنامہ ''مخزن'' لاہور ، اپریل ۱۹۵۰ء ، ۵۸ ، ۵۹ ۔

۲۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ اول) مرتب شیخ عطاء اللہ لاہور ۱۹۴۹ء ، ص ۲۲۸ ، ۲۲۹ ۔

دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کا حج قبول فرمائے اور آپ کو اپنے دین کی محبت اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ و سلم کے عشق سے مالا مال فرمائے ۔ امید ہے کہ اس خط کے پہنچنے تک جمال دین والی میں پہنچ گئے ہوں گے ۔''[۱]

بات یہ ہے کہ حضرت علامہ اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے اخلاف کی بے عملی اور بے حسی سے سخت نالاں تھے ۔ اور جب وہ ان گھرانوں سے متعلق کسی نوجوان میں علم و عمل کی صلاحیت پاتے تو بہت خوش ہوتے اور کوشش کرتے کہ وہ نوجوان اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر دین اسلام کی خدمت کرے اور قوم کی راہنمائی کرے ۔ ایسے نوجوانوں میں حضرت خواجہ نظام الدین دربار تونسہ شریف اور سید غلام میراں شاہ دربار جمال الدین والی (بہاول پور) نمایاں حیثیت کے مالک تھے ۔ چنانچہ علامہ نے ان نوجوانوں سے رابطہ قائم کیا اور انہیں اپنے اسلاف کے زریں کارناموں کو دلیل راہ بنانے کا مشورہ دیا ۔ ایک خط میں حضرت علامہ مخدوم صاحب کو تحریر کرتے ہیں :

''آپ کے احباب اور مخلصین آپ سے اُس روحانیت کی بنا پر جو آپ نے اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں پائی ہے ۔ بہت بڑی بڑی امیدیں رکھتے ہیں ۔ ان امیدوں میں میں بھی شریک ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ آپ کو اس امر کی توفیق دے کہ آپ اپنی قوت ، ہمت ، رسوخ اور دولت و عظمت کو حقائق اسلام کی نشر و اشاعت میں صرف کریں ۔ اس تاریک زمانے میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ و سلم کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے ۔ افسوس کہ شمال مغربی ہندوستان میں جن بزرگوں نے علم اسلام بلند کیا اُن کی اولادیں دنیوی جاہ و منصب کے پیچھے پڑ کر تباہ ہوگئیں اور آج اُن سے زیادہ جاہل کوئی مسلمان مشکل سے ملے گا ، خدا تعالیٰ انہیں بزرگوں کی اولاد سے کسی کی روحانیت بیدار کر دے اور کلمۂ اسلام کے اعلاء پر مامور کرے ۔''[۲]

یہ ہے حضرت علامہ کی صوفیائے عظّام سے عقیدت کی مختصر داستان ۔

۱۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ اول) مرتب شیخ عطاء اللہ ، ص ۲۳۲ ۔
۲۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ اول) ، ص ۲۳۱ ، ۲۳۲ ۔